لام کا اخلاقی نظام

کے اخلاقی نظام پر مسیحی اعتراض کا تحقیقی جواب

نتیجہ فکر

سلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب

مہتمم دار العلوم دیوبند

ادارۂ تاج المعارف دیوبند یوپی

(۳) سہ ماہی سلسلہ مطبوعات ع ۳۸

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

اسلام کا اخلاقی نظام

ایک عیسائی پادری کے اسلام کے نظام اخلاق پر چار سطحی اعتراضات کے عقل و نقل کی روشنی میں حکیمانہ اور تحقیقی دندان شکن

(جوابات)

"رشحہ قلم سرپرست ادارہ"

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ

"مہتمم دار العلوم دیوبند"

ناشر

ادارہ تاج المعارف دیوبند

یو.پی (انڈیا)

(سید زاہد حسن)

ادارے کے سہ ماہی پروگرام کی اڑتیسویں ۳۸ کتاب

اسلام کا اخلاقی نظام

دوسری اور تیسری مشترکہ سہ ماہی ——— جون و ستمبر سنہ ۱۹۶۱ء

قیمت ——— تین روپیہ (۳)

مطبوعہ ——— کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی

(زیرِ نگرانی)

خطیب العصر حضرت مولٰنا محمد سالم صاحب قاسمی ناظم ادارہ
واستاذ دار العلوم دیوبند

اِس کتاب کے مطالعے سے قبل

ہمدست کتاب "اسلام کا اخلاقی نظام" دراصل ڈاکٹر اڈورڈ سے مسیح صاحب رڑکی ضلع سہارنپور کیجانب سے حضرت حکیم الاسلام مدظلہ، کو موصول ہونیوالے چار اعتراضات کے محققانہ جوابات پر مشتمل ہے۔ پادری صاحب کا اصل مکتوب کتاب ہذا کے صفحہ (۱) پر درج ہے کتاب کے مطالعہ سے قبل ایک نظر اُس پر ضرور ڈال لیجئے۔ موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے کتاب ہذا سہ ماہی کتابوں کی متعینہ ضخامت سے زیادہ صفحات پر جون سنہ ۶۱ء اور ستمبر سنہ ۶۱ء کی مشترکہ کتاب کی حیثیت سے نذر قارئین کیجارہی ہے۔

(مینجر ادارہ)

فہرست مضامین

پیش لفظ

عرصہ ہوا کہ حکیم الاسلام حضرت الحاج مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ کی خدمت میں رڑکی ضلع سہارنپور کے ایک پادری ڈاکٹر اودے مسیح صاحب کا خط موصول ہوا جسمیں اسلام کے نظام اخلاق پر اعتراضات کرتے ہوئے دعویٰ کیا گیا تھا کہ اسلام نے کوئی اخلاقی نظام پیش نہیں کیا، بلکہ معاذ اللہ بداخلاقی کی بنیادیں قائم کی ہیں۔ اس کے برخلاف اگر اخلاقی نظام مل سکتا ہے تو وہ صرف انجیل میں مل سکتا ہے چنانچہ اس نے اخلاق کے سلسلہ میں دس منفی باتیں صاف صاف پیش کردی ہیں یعنی چوری، زنا، اور قتل وغیرہ سے بصراحت منع کیا گیا ہے۔ پادری صاحب مذکور کے جواب میں حضرت حکیم الاسلام مدظلہ، نے مختصراً تحریر فرمایا کہ یہ شبہ اسلام کی تعلیمات اور اس کے اصول و فروع سے لاعلمی اور ناواقفی پر مبنی ہے، مکمل طریق پر نظام اخلاق اگر کسی مذہب نے پیش کیا ہے تو وہ صرف اسلام ہے، اُس نے دس پانچ باتیں نہیں بلکہ اخلاق کے ننانوے ایسے اصول پیش کیے ہیں جن کے دائرہ سے کوئی بھی چھوٹا بڑا خلق باہر نکلا ہوا نہیں ہے، پادری صاحب نے حضرت موصوف مدظلہ، کے نام دوبارہ خط لکھا جسمیں اپنے سابقہ دعویٰ کو دہراتے ہوئے مطالبہ کیا کہ وہ ننانوے اخلاق۔ کون سی آیت سے ثابت ہیں کم از کم دو چار ہی پیش کردیے جائیں، ساتھ ہی

اسلامی نظام اخلاق پر دو چار اعتراض اور بھی کئے جن کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام میں نظام اخلاق تو کیا ہوتا معاذ اللہ بداخلاقیوں کے دروازے کھول دیے اس خط کے جواب میں حضرت حکیم الاسلام مدظلہ نے تفصیلی جواب بصورت خط تحریر فرمایا جسمیں اسلام کے اخلاقی نظام پر محققانہ بحث کیگئی ہے اور اخلاق کے بنیادی اصول کو قرآن و حدیث سے واضح طریق پر پیش کرتے ہوئے پادری صاحب کی ہفوات کے مکمل و مدلل اور مسکت جواب دیئے ہیں یہ جوابی تحریر جونکہ اسلام کے بہت سے حقائق پر مشتمل ہے۔ جس سے اسلامی نظام اخلاق کی بنیادی محاسن واضح ہوتے ہیں، اور ساتھ ہی انجیل کی دعویٰ کردہ دیں اخلاقی باتوں کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے اس لیے ہم اس خط کو جو درحقیقت اسلام کے نظام اخلاق کی جامع اور حکیمانہ تشریحات پر مشتمل ہے۔ نذر قارئین و معاونین کرام کرنیکی سعادت حاصل کرتے ہیں ۔

وجوہ تاخیر

تاج المعارف کے آٹھ سالہ طویل دینی اشاعتی پروگرام میں ہمارے لئے یہ پہلا تکلیف دہ موقع ہے کہ جون ۱۹۶۱ء کی سہ ماہی کتاب وقت پر نہ پیش کیجا سکی یہ تاخیر چند وجوہ کی بنا پر ہوئی جن کے معلوم ہونیکے بعد امید ہے کہ معاونین کرام ہماری معذرت کو قبول فرمالیں گے۔

(۱) اولاً یہ کہ اس عرصہ میں کارکنانِ ادارہ میں ناگزیر تبدیلی رونما ہوئی جسکے نتیجہ میں انتظامی امور بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے (۲) پھر حضرت مصنف مدظلہ کے اسفار اور غیر معمولی مصروفیات کیوجہ سے کتاب کی ترتیب و تالیف وقت پر

مکمل نہ ہو سکی اِدھر ناظم ادارہ کے اسفار و مشغولیات بھی وجہ تاخیر بنے!

(۳) اُدھر جنرل الیکشن کے ہنگامی کاموں کیوجہ سے کاتب اور پریس اسقدر مصروف رہے اور ہیں کہ وقت پر کتابت و طباعت نہ ہو سکی! (۴) نیز موضوع کی ظاہری و معنوی اہمیت کے پیش نظر خواہش یہ ہوئی کہ کتاب خواہ کتنی ہی طویل ہو ایک ہی جلد میں پیش کیجائے تاکہ ربط استفادہ و مطالعہ تشنہ نہ رہے۔

ان ہی مختلف اتفاقی وجوہ کے پیش آجانیکی وجہ سے کتاب کو پیش کرنے میں خلاف معمول تاخیر ہوئی جس کا معاونین سے زیادہ ہم کو ملال ہے!

(تلافی)

اسکی تلافی ہم اس طرح کر رہے ہیں کہ جون اور ستمبر کی مشترکہ ایک کتاب صرف تین روپیہ میں پیش کر رہے ہیں جبکہ پیش نظر کتاب کی ضخامت تقریباً پچھلی دو کتابوں کے برابر ہے اور دو کتابوں کا صرفہ معاونین کے ذمہ تقریباً چار روپیہ ہوتا تھا اسطرح معاونین کرام کو ایک روپیہ کی کفایت بھی ہو گئی!

محمد سالم قاسمی

ناظم ادارہ تاج المعارف دیوبند

۶؍ستمبر سنہ ۱۹۶۱ء

مکتوب اعتراض

منجانب ڈاکٹر او دے میسح ہومیوپیتھ، رڑکی ضلع سہارنپور

(بنام)

حکیم الاسلام حضرت مولینا محمد طیب صاحب مدظلہٗ

مہتمم دار العلوم دیوبند

ڈاکٹر اودے مسیح،
ہومیو پیتھ رجسٹرڈ نمبر ایچ ۹۶۹ع
رڑکی ضلع سہارنپور (یوپی)

رڑکی ۱۳ جون ۵۹ء

جنابعالی۔ آپ کو اور آپ کے عزیزوں کو تسلیم" خداوند کریم ہم سبکو اور آپ سب عزیزوں کو برکت عنایت فرمائے اور تمام بنی نوع انسان کو اپنی پیاری اور پاک مرضی پر چلنے کی قوت عنایت فرماوے اور اس ابلیس کی چالوں سے محفوظ رکھے۔

آپکا لفافہ پاکر جو کہ آپ نے بڑی مہربانی سے میری چٹھی کے جواب میں ارسال فرمایا ہے، نہایت ہی شکر گزار ہوں، حقیقت میں آپنے بڑی مہربانی فرماکر یہ تکلیف کی، لیکن آپ کے جواب سے تسلّی نہ پاکر پھر آپ کی خدمیں عرض کرتا ہوں کہ آپ کم از کم یہ کوشش ضرور کریں کہ میری چٹھی کا منشا اور مفہوم ضرور سمجھ لیا کریں۔ کیوں کہ میں ایک بال بچّے دار آدمی ہوں اور خداوند کریم کے فضل سے میرے پاس کمسن سے لیکر جوان عمر کے بچّے ہیں حالانکہ میرا سب سے چھوٹا بچّہ بہت ہی ٹوٹی پھوٹی زبان بولتا ہے پھر بھی میں اسکی تمام باتونکا مطلب سمجھ لیتا ہوں اور کبھی بھی اس کو ٹالنے کی کوشش نہیں کرتا صرف اس بنا پر کہ "تم چلے جاؤ" "بس تمہاری درخواست پوری نہیں کرونگا، کیونکہ تمہاری عبارت مجمل اور مہمل ہے"

میری منشا آپ سے سوال کرنے کی یہ ہے کہ میرے سوالوں کا جواب صرف قرآن ہی سے دینے کی تکلیف گوارہ فرمادیں اور اگر ضرورت ہو تو آپ

بڑی مہربانی سے بائیبل کا حوالہ بھی پیش کیجئے گا کیونکہ اہلِ اسلام کا Standard میں قرآن ہی کو مانتا ہوں جس طور پر مسیحیت کا Standard بائیبل ہے کوئی پادری یا پوپ یا اور کوئی انفرادی ہستی میں مسیحیت کا Standard نہیں مانتا ہوں اور میرا پورا بھروسہ ہے کہ آپ بھی کسی انفرادی ہستی کو (یعنی پادری، پوپ وغیرہ) نہ تو مسیحی "اخلاقی معیار" مانیں گے اور نہ ہی کسی مولوی یا قاضی وغیرہ کو اسلام کا "اخلاقی معیار" مانیں گے۔ اگر ایک پادری یا بہت سے پادریوں نے حکومت کے بل بوتے پر دلائل کو ترک کر کے ظلم اور تشدد کے ذریعہ مسیحیت پھیلانے کی کوشش کی ہو تو اس کی ذمہ داری بائیبل پر ہرگز نہیں ہو سکتی، اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے بیشک قرآنی ہدایت تو ضرور ہے کہ " گردنیں مارو اُن کی جب تک نہ ہو جاویں وہ مطیع تمہارے" آپ نے قرآنی "اخلاقی معیار" کی گنتی ننانوے تو ضرور فرما دی لیکن آپ نے یہ نہ فرمایا کہ وہ ہیں کونسی اور نہ ہی آپنے اُن کا قرآنی حوالہ فرمایا کہ وہ قرآن میں کون سی سورۃ میں مندرج ہیں۔ میں نے تو آپ کو مسیحی "اخلاقی معیار" سے متعلق "دس احکام" عرض کر دیے تھے اور دس احکام میں سے تین چار کو تحریر بھی کر دیا تھا مثلاً "تو چوری مت کر"۔ "تو خون مت کر" "تو زنا مت کر" لیکن قرآنی ننانوے کی گنتی کے علاوہ میں یہ جاننے سے قاصر رہا کہ وہ ننانوے کون سے ہیں کم از کم پانچ سات کو ضرور ہی تحریر فرما دیجئے گا۔ آپ نے اپنی چٹھی میں یہ فرمایا تھا کہ "قرآن کی کون سی آیت نے آپ کو چکر میں ڈال دیا" جواباً عرض ہے کہ "قرآن میں

اگر وہ آیتیں نکال لی جاویں جو کہ قرآن سے سینکڑوں برس پیشتر بائبل میں بیان ہو چکی ہیں تو پھر قریب قریب ساری ہی باتیں قرآن کی چکر میں ڈالنے والی رہجاتی ہیں، اور میں اس جگہ ایک ہی بات کو لیکر اپنی غرض آپکی خدمت میں پیش کروں گا:۔ بائبل میں خروج کی کتاب اس کے بیسویں باب کی سترہ آیت "تو اپنے پڑوسی کی بیوی کا لالچ نہ کرنا" قرآنی زمانہ سے پہلے اور اہل قرآن کو چھوڑکر باقی تمام اقوام میں یہ دستور رہا ہے اور آجکی تاریخ میں بھی ہے کہ جس لڑکے کو گود لے لیا وہ بیٹا لگ بنکر حقیقی بیٹے کے درجہ کو پہنچ گیا اور ٹھیک اسیطرح اسکی بیوی کو بھی وہ درجہ اور مرتبہ حاصل ہوگیا جو اپنے حقیقی بیٹے کی بیوی کو ہوتا ہے۔ یہ تو ایک عام بات ہے جاہل سے جاہل لوگ بھی اپنے پڑوس لی اور دیگر لڑکیوں کو بیٹی کہکر اپنی جورو ہرگز نہیں بناتے سوائے اھل اسلام کے۔ اور اگر ہم بائبل کو پڑھیں تو اپنی ایک بیوی

کے علاوہ تمام دیگر عورتوں کو ماں، بہن، اور بیٹی کہا گیا ہے (اتم $\frac{5}{1-2}$) لیکن قرآنی "اُخلاقی معیار" تو ایک عجیب چیز نظر آتی ہے جب اپنی بہو (بیٹے کی بیوی)، پر طبیعت چل گئی تو پھر فوراً آسمانی وحی نے ساری روحانیت۔ اور نیکی اور سچائی پر ایسا بھاری پردہ ڈال دیا کہ تمام دینداری چھپ گئی اور اپنے بیٹے کی جورو کو اپنی جورو بنانیکا حق اللہ میاں سے حاصل ہوگیا۔

پڑھیئے سورہ الحزاب" خدا اپنے رسول سے فرماتا ہے "تو چھپاتا تھا دل میں ایک بات اللہ کرنا چاہتا تھا اسکو ظاہر تو ڈرتا تھا انسان سے ڈرنا چاہیئے صرف اللہ ہی سے" یہاں تک کی عبارت سے تو ایسا معلوم پڑتا ہے

کہ "متکلم" "خاطر" کی کوئی ایسی بات بتانا چاہتا ہے جس کو ظاہر کرنے سے "خاطر" کو ڈر لگتا تھا لیکن حقیقت میں "خاطر" میں اس بات کو کرنے کی لو لگی ہوئی ہے۔ لیکن خوف اور ڈر کی وجہ سے اس بات کو عمل میں لانے کی ہمت نظر نہیں پڑتی ڈر ہے کہ کہیں لوگ ابتک کی کری ہوئی محنت پر پانی نہ پھیر دیں لیکن ایک قدم ہی آگے بڑھ کر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کام کو انجام تک پہنچانے کا بہانہ ہاتھ لگ جاتا ہے کہ "ہم نے دیا زینب کو تیرے نکاح میں جب زید پوری کر چکا اس سے اپنی غرض تا نہ رہے گناہ مسلمانوں پر اپنے لےپالک بیٹوں کی جوروں کا اپنے نکاح میں لینا جب کر چکے وے اُن سے اپنی غرض پوری"، کیا خدا اپنی دی ہوئی شریعت کو اس طرح کی شریعت سے منسوخ اور باطل کر سکتا ہے جیسیں کہتا ہے کہ تو اپنے پڑوسی کی جورو کا لالچ نہ کرنا" یہ بات تو بالکل عقل کے خلاف ہے یا آپ یہ ثابت کیجیے کہ بائبل کا یہ حکم کہ "تو اپنے پڑوسی کی جورو کا لالچ نہ کرنا" نہایت ہی بوسیدہ نامعقول اور بیکار ہے۔ ورنہ تو آپ کو یہ ماننا پڑیگا کہ زید کی بیوی کا "نبی کی جورو بنا دینے کا حکم" غلط ہی نہیں بلکہ گناہ اور زناکاری کو فروغ دینا ہے کیونکہ خدا ایسی بات کبھی نہیں کر سکتا کہ ایک موزوں جوڑے کو توڑ کر ایک نہایت ہی غیر موزوں جوڑا بنا دے، کیوں کہ زید ایک جوان۔ تندرست۔ خوبصورت اور تعلیم یافتہ تھا اور اسی طرح اس کی بیوی بھی جوان اور خوبصورت تھی لیکن بخلاف اس کے محمد صاحب ایک نہایت ہی عمر رسیدہ انسان تھے جو کہ اس غیر موزوں انتظام کے

کچھ ہی عرصہ بعد اس دنیائے فانی سے ہمیشہ کیلئے کوچ کر گئے۔ اور جبکہ محمد صاحب کے پاس پہلے ہی دسیوں جوروان تھیں۔ معلوم نہیں اللہ میاں کو کونسی فکر محمد صاحب کے واسطے دامنگیر تھی یا صرف محمد صاحب کی مرضی پوری کرنے اور اپنی شریعت کو باطل کرنے کی غرض سے یہ انتظام خدا نے کیا۔ اگر اللہ میاں لے پالک بیٹوں کی جوروؤں کو اپنے والدوں کی جوروئیں بنانے کا قرآنی قانون نہ بناتا تو کونسی نیکی کی کمی اس دنیا میں ہو جاتی؟

اگر ہم صحیح بخاری پارہ تیرہ کتاب بدر الخلق صفحہ ۱۶ کو پڑھیں تو ہمکو مندرجہ بالا قرآنی وحی کا پوری طور پر بھید معلوم ہو جاتا ہے آیت یہ ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جبرائیل نے مجھ سے کہا تمہاری امت میں جو کوئی اس میں مرے کہ شرک نہ کرتا ہو وہ بہشت میں جاویگا یا یوں فرمایا دوزخ میں نہ جاویگا۔ ابو ذر نے کہا اگرچہ وہ زنا کرتا ہو اور چوری کرتا ہو۔؟ آپ نے (محمد صاحب نے) فرمایا گو وہ زنا اور چوری کرتا ہو؟ کیا یہی ہے قرآنی "اخلاقی معیار" عزیز من مندرجہ بالا بیان سے تو یہ ثابت ہو گیا کہ جتنی بدکاری چاہے کرو لیکن صرف ایک بات مانتے رہو کہ اللہ لاشریک ہے اللہ بڑا مہربان ہے اور معاف کرنیوالا اور بخشنے والا ہے لیکن اس قرآنی تعلیم کے خلاف بائبل کا فرمان ہے کہ "نہ حرامکار۔ خدا کی بادشاہی کے وارث ہوں گے نہ بت پرست، نہ زناکار، نہ عیاش، نہ لونڈے باز نہ چور نہ لالچی، نہ شرابی، نہ گالیاں بکنے والا، اور نہ ظالم" (پہلا کرنتھیوں $\frac{6}{9}$)

بائبل کے نقطہ نگاہ سے ایک مرد کیلئے ایک سے زیادہ جوروئیں رکھنا

اور عورتوں کے پاس ایک سے زیادہ شوہر ہونا حرامکاری اور عیاشی
ہی ہے (پہلا کرنتھیوں ططس، ۱/۲)

اب آپ ہی خود انصاف کریں کہ کون سی تعلیم بائیبل کی یا قرآن کی
ماننے کے قابل ہے یہ بات تو آپ کو ضروری ماننی پڑے گی کہ مندرجہ بالا
اخلاقی معیاروں میں ایک تو باطل ہے ہی۔ کیونکہ یہ ایک دوسرے کے خلاف
ہیں۔ فی الحال میں صرف ایک ہی "اخلاقی معیار" کے حصہ کو یعنی زنا نہ کرو کو
آپ کی خدمت میں پیش کیا امید کہ بندے کو تسلّی دینے کی مہربانی فرمائیں گے
اور ساتھ ہی ساتھ تکلیف کے واسطے معافی فرمائیں گے۔ آپ کا بہت
بہت شکریہ۔ خدا آپ کو اور آپ کے دوستوں ساتھیوں اور عزیزوں
کو برکت عنایت فرمائے اور نجات کی راہ دکھا دے جو کہ صرف خداوند
یسوع مسیح ہی میں ہے کیونکہ یہ وہی پتھر ہے جسے (یعنی خداوند یسوع
مسیح کو) تم معماروں نے حقیر جانا اور وہ کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا
اور کسی دوسرے کے وسیلہ سے نجات نہیں کیونکہ آسمان کے تلے آدمیوں
کو کوئی دوسرا نام نہیں بخشا گیا جس کے وسیلہ سے ہم نجات پا سکیں
(اعمال ۴/۱۱-۱۲)

فقط مسیح میں آپکا خادم

Udai masih

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کا اخلاقی نظام

مکرم بندہ جناب ڈاکٹر صاحب زید لطفکم

آداب نیازمندانہ کے بعد عرض ہے کہ آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۱۳ جون ۵۹ء کو صادر ہوا تھا مگر میں نہایت شرمندگی کے ساتھ آج بہت کافی عرصہ کے بعد آپ کے والانامہ کا جواب لکھ رہا ہوں۔ درمیان میں قدرتی مواقع ایسے پیش آتے رہے کہ میں ارسال عریضہ کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ آپ کا والانامہ پہنچا ہی تھا کہ مجھے مصر اور افریقہ کا سفر پیش آگیا اور اس میں تقریباً تین ماہ لگ گئے وہاں سے واپسی ہوئی تو چند ہی دن کے بعد میری والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا اس سلسلہ میں ماہ ڈیڑھ ماہ تک لوگوں کی آمد و رفت رہی اور لکھنے کا وقت نہ نکل سکا پھر متصلاً ہی بہار کا طویل سفر پیش آگیا۔ وہاں سے واپسی ہوئی تو اچانک آسام کا سفر سامنے آگیا غرض اسی طرح پے در پے اذکار و اسفار پیش آتے رہے۔ اور والانامہ کے جواب کی ساعتیں نہ آسکیں۔ ارادہ کیا کہ کچھ بھی ہو تحریر جواب شروع کر دی جائے کہ کلکتہ

اور بنگال کا لمبا سفر دامنگیر ہو گیا، تاہم یہ خیال کرتے ہوئے کہ فرصت کامل اور دلجمعی کے انتظار میں برس گذر جائیں گے اور فرصت کی یہ متاع گرانمایہ اس طرح کبھی بھی ہاتھ نہ لگ سکے گی اس بے فرصتی کے باوجود ہی جواب کی تحریر شروع کر دی۔ ابھی ابتدا ہی ہوئی تھی کہ اچانک سفر حج سامنے آگیا۔ اس سفر میں جواب کے ابتدائی اوراق ساتھ رکھ لئے اور ریل اور جہاز کے کیبن میں قدرے موقع بھی ملا جس سے تحریر کی تکمیل میں لگ گیا دن کو موقعہ نہ ملتا تو آخر شب میں قلم ہاتھ میں لیکر بیٹھ جاتا امید تھی کہ شاید جدہ پہنچتے پہنچتے تحریر مکمل ہو جائے گی اور ہندوستان پہنچکر اسے سپرد ڈاک کر دیا جائے گا لیکن جہاز کے غیر معمولی مشاغل کی وجہ سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ تو مدینہ منورہ میں جو تھوڑا تھوڑا تھوڑا وقفہ ملتا رہا اس میں ان اوراق پریشان کو لیکر بیٹھتا رہا اور تھوڑی بہت تکمیل کی سعی جاری رہی لیکن مکہ مکرمہ پہنچکر افعال حج کی مصروفیات غالب رہیں جن میں کسی اور کام کا سوال ہی نہ تھا۔ واپسی کے وقت بیماری اور علالت نے رفاقت کی جو طویل ہو گئی اور کسی اور چیز کی رفاقت کی گنجائش ہی نہ دی خدا خدا کر کے ۲۹ جون ۵۶ء کو دیوبند پہنچا مگر بحالت علالت اور اسی کے ساتھ دارالعلوم کے ہنگامی حالات کی مشغولی نے بیماری ہی کو بھلا دیا چہ جائیکہ تحریر جواب کا شغل قائم رکھا جاتا۔ اب ذرا طبیعت بھی سنبھلی ہے اور وقت نے بھی یاری کی ہے تو پھر اس افسانۂ ماضی کو لیکر بیٹھا ہوں خدا کرے کہ داستان جلد ہی پوری ہو جائے۔ مگر اب جب بھی مکمل ہو جناب سے تو جو شرمندگی ہونی تھی وہ تو ہو ہی گئی، اب برس دن گذرے یا برس کا سوا برس ہو جائے۔ کوشش کرتا ہوں کہ اب زیادہ تاخیر نہ ہو۔ مگر میرے مشاغل اور ذمہ دارانہ ہونے کے ساتھ ساتھ متفرق اور

مختلف الانواع بھی ہیں جو کسی کام کو یکسو ہو کر نہیں چلنے دیتے اور یوں بھی انسان ابن الحال ہے۔ اسے حالات کا اسیر ہونا ہی پڑتا ہے۔ عذرات کی یہ لمبی داستان لیکر آپ کا وقت محض اس لئے ضائع کیا ہے کہ اس تاخیر کو اس ناکارہ کے تساہل اور کاہلی پر محمول نہ فرمادیں۔ بلکہ مجبوری اور معذوری پر جو انسان کا پیدائشی جوہر ہے اگر انسان بہر صورت ہر صورت پر قدرت محض رکھتا ہوتا تو کبھی بھی اس کا کوئی کام وقت اور موقع سے ٹلتا مگر نہ زمانہ اس کے ہاتھ میں ہے نہ زمانیات قبضہ میں ہیں بلکہ وہ خود ہی ان کے ہاتھ میں کھلونے کی طرح ہے۔ تنظر بریں قلم تو ہاتھ میں اٹھالیا ہے اور نتیجہ کی فکر چھوڑ دی ہے جب بھی تحریر پوری ہو جائے گی ارسال کردی جائے گی۔ آپ کو جواب کے لئے جو زحمت انتظار کی تکلیف اٹھانی پڑی اس کی معافی چاہتا ہوں۔

گرامی نامہ سے آپ کے ذوق تحقیق کے ساتھ انکساری طبع کی روش سے خوشی ہوئی۔ اختلاف دین کے باوجود اگر طبائع میں یہ جوہر ہو تو دو غیر مذہب انسانوں میں خیر خواہی اور موعظت و نصیحت کا جذبہ قائم رہ سکتا ہے جو نیک راہ سامنے آجائے اور حق بینی کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ البتہ آپ کی تحریر میں الزام و اعتراض کے موقعوں پر جگہ جگہ متانت و سنجیدگی کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے حتی کہ بعض جگہ استہزاء و تمسخر اور تحقیر و توہین کا رنگ بھی آگیا ہے۔ اگر جواب میں بھی رد و الزام کے موقعوں پر کہیں ایسا رنگ نظر آئے تو اسے اپنی ہی تحریر کا آورده اور رد عمل سمجھا جائے۔ پھر بھی انشاء اللہ مقتداؤں کی توہین یا استہزاء کا کوئی ایک کلمہ بھی اس تحریر میں آپکو نہیں ملیگا۔ اور اگر کہیں ایسا بھی ہوگا تو وہ آپ ہی کے دعووں پر بطور فرض و الزام کے ہوگا۔

مسائل زیر بحث کی اہمیت و نزاکت اور ساتھ ہی بظاہر آپ کے انداز تحقیق کے پیش نظر مجھے جرأت ہوتی ہے کہ قدرے تفصیل کے ساتھ اپنی معروضات پیش کرتے ہوئے آپ کا کچھ قیمتی وقت لوں بلکہ کچھ نرم گرم سنا کر آپ کی طبیعت میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کروں۔ امید ہے کہ اس جرأت پر آپ مجھے معاف فرمائیں گے، اور خاص انصاف پسندی کے جذبات سے میری تحریر پر غور فرمائیں گے۔ میرے سابقہ عریضہ کے بھی کسی عنوان یا لب و لہجہ سے آپ کو گرانی ہوئی ہو تو میں خلوص دل سے اس کی بھی معافی چاہتا ہوں۔ مگر صدائے دل سنانے پر مجبور ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

محترم من چونکہ آپ کو اسلام کے متعلق صحیح اور پوری معلومات حاصل نہیں ہیں اس لئے اسلامی مسائل کے بارہ میں شکوک و شبہات کا طبیعت میں پیدا ہو جانا غیر طبعی نہیں۔ اگر آپ جیسے اصول پسند آدمی کے سامنے صحیح معلومات کا ذخیرہ پیش کر دیا جائے تو آپ سے صحیح رائے قائم کرنے کی بہر حال توقع ہے۔

آپ نے یہ اصول تحریر فرمایا ہے اور بالکل صحیح تحریر فرمایا کہ "مذہب یا مذہبی باتوں کو پرکھنے کے لئے کسی مولوی، قاضی، یا پادری کی ذاتی روش کسوٹی نہیں بن سکتی اس کی کسوٹی اگر ہو سکتی ہے تو پیغمبر کی ذات اور خدا کا قانون ہی ہو سکتا ہے" (اور میرے تھوڑے سے اضافہ کے ساتھ) یا پھر ساتھ ہی وہ کہ جس کو خدا اور خدا کا رسول ہی کسوٹی قرار دیں۔ اس لئے کسی مسئلہ کے حق و باطل کے پرکھنے کے لئے حقیقی کسوٹی خدا و رسول ہیں اور ان کے فرمانے سے اضافی طور پر اس کسوٹی کا تتمہ وہ افراد ہیں جن کے معیاری ہونے کی خدا اور رسول نے خود شہادۃ دی ہو۔ ہر کس و ناکس اس مقام پر نہیں آسکتا۔ یہ اصول صرف مذہبی ہی

نہیں عقلی بھی ہے جس کی اساس و بنیاد یہ ہے کہ خدا کا قانون دستور اساسی ہوتا ہے جس میں اصول و کلیات اور صرف اساسی باتیں ہوتی ہیں تاکہ وہ کسی ایک وقت اور ایک زمانہ کے ساتھ مقید نہ رہے بلکہ اپنے دور دورہ کے ہر زمانہ کے سارے اوقات میں کار آمد اور کار فرما ثابت ہو۔ بالخصوص جبکہ وہ قانون آخری اور دوامی بھی ہو۔ اور اس طرح ہر زمانہ کے پیش آمدہ حوادث و جزئیات کا اس کے اصول کلیہ سے فیصلہ ہوتا رہے اس لئے وہ جامع ہونے کے باوجود مختصر اور مجمل ہوتا ہے۔ پیغمبر کی ذات قدسی اس کے حق میں عملی درس اور اس کے اصولی امور کی واقعاتی تشریح ہوتی ہے جس میں اس کے مجملات کی تفسیر اور مختصر اکی تفصیل پنہاں ہوتی ہے اس سے قانون الٰہی کے مطالب و معانی اور مرادات کھلتی اور متعین ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔ اس لئے پیغمبر کی روش قول و فعل نشست و برخاست اور زندگی کے عملی نمونوں سے دین کی صورت اور دین کی مستند تاریخ بنتی ہے جو خدا کی کتاب کے بعد دین کیلئے قوی ترین حجت ہوتی ہے جس سے احکام نکلتے بھی ہیں اور نازل شدہ احکام کھلتے بھی ہیں۔

پھر پیغمبر کے اسوۂ حسنہ کی توضیح و تنقیح اور ساتھ ہی تشخیص پیغمبر کے بعد کا وہ طبقہ کرتا ہے جو پیغمبر سے بلاواسطہ کسب فیض کرنے سے اتباع پیغمبر میں فنا ہو کر مجسم دین و دیانت اور پیکر تقویٰ و طہارت بن جاتا ہے اور پیغمبر کے اس بلاواسطہ فیضان صحبت سے اس کی روحانیت مابعد کے سارے طبقات سے اونچی اور برتر ہوتی ہے۔ اس طبقہ کے قول و فعل

براہ راست خود اصل شریعت یا شریعت بننے کیلئے حجت نہ ہو تو کم از کم شرعی حجتوں کی جزئیاتی تشریح و توضیح اور تعین مرادات کے لیے حجت ضرور ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے پیغمبر کے قول و فعل کا اصلی خاکہ اور رنگ و روپ کھلکر سامنے آجاتا ہے اور اللہ و رسول کی مرادیں جو ان کی تعبیرات میں لپٹی ہوئی ہوتی ہیں ان پاکبازوں کی مجسم دینی زندگی اور اس زندگی کی پاکبازانہ روشوں اور سچے قول و فعل کے نمونوں سے گویا مجسّم ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔ اس لیے ان بزرگوں کا قول و فعل دین کے اصول و فروع کے لیے اسی طرح سند ہوتا ہے جیسے ہائی کورٹ کے قابل اور فاضل ججوں کے فیصلہ قانونی دفعات کے پہلو اور رخ متعین کرنے میں دلیل اور سند مانے جاتے ہیں اور ماتحت عدالتوں کے لیے قانونی حجت کا درجہ رکھتے ہیں۔ جنھیں اگر اصل قانون نہیں کہا جا سکتا تو قانون سے الگ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ قانون ہی کے تقاضوں اور اس کے مضمرات کا ایک ظاہر شدہ حصہ سمجھا جاتا ہے جو دین سے الگ نہیں ہوتا بلکہ اس سے دین اور دینی احکام کی تاریخ بنتی ہے جس کے بغیر نہ دین سمجھا جا سکتا ہے نہ دین کی تفصیل سامنے آسکتی ہے اور نہ ہی دینی مذاق قلوب میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے نتیجتہً وہی قانون ہی کی حیثیت لے کر کھلے طور پر قانون کی تاریخ اور نظری طور پر قانون کے مضمرات کا ایک اہم جزو باور کیا جا سکتا ہے۔

اندریں صورت قانون خداوندی کو اس کی تاریخ سے الگ کر

سمجھنے کی کوشش کرنا دین کے مقاصد سمجھنے میں کبھی کامیاب نہیں بنا سکتا جبکہ اس تاریخ کے بغیر دین کی صحیح تصویر ہی سامنے نہیں آسکتی۔ اسی لئے قرآن نے تین اطاعتیں مسلمانوں پر فرض کی ہیں خدا کی اطاعت رسول کی اطاعت اور اولوا الامر یعنی راسخین فی العلم کی اطاعت خواہ وہ مادی قوت ہی رکھتے ہوں۔ جنھیں اُمرار کہا جاتا ہے یا نہ رکھتے ہوں اور انہیں خلفار کہا جائے۔ بہر صورت یہی لوگ حقیقی معنی میں وارثان نبی ہو کر واجب الاطاعت ہوتے ہیں۔

ارشاد قرآنی ہے۔

یا ایھا الذین اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم	اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اسکی جو تم میں علم کیساتھ امر کرتا ہو۔

خدا کی اطاعت بالذات ہے رسول کی اطاعت بوصف رسالت ہے اور صاحب امر (یعنی راسخین فی العلم) کی اطاعت بوصف تبابع رسالت ہے تاکہ وہ دین کو چلائے اپنی ذاتی بات نہ چلائے۔

اگر دین میں یہ مجسم دین شخصیتیں اور ان کے علمی اُسوے و نمونے ضروری نہ ہوتے تو دنیا میں قانون خداوندی کیساتھ پیغمبر نہ بھیجے جاتے اور پیغمبر اپنے بعد کے کامل مطیعانِ رسالت کی اطاعت و پیروی ضروری نہ قرار دیتے بلکہ صرف قانون اتار دیا جاتا کافی سمجھا جاتا اور آسمان سے ایک آواز لگا دی جایا کرتی کہ اے لوگو تم سب کے سب مریضانِ نفوس ہو اور یہ آسمانی کتاب تمہارے لئے نسخۂ شفا ہے اسے پڑھو۔

اور اپنے مریض نفوس کا خود ہی علاج کر لو یعنی طب کافی ہو جاتی طبیب کی حاجت نہ پڑتی جو مزاجوں کو پہچان کر اس طب ایمانی سے نسخے دیتے مریض خود ہی اپنے معالج ہو جایا کرتے۔ اور خود ہی شفا پا لیا کرتے مگر جب کہ ایسا نہیں ہے اور نہ کبھی ایسا ہوا کہ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ بلکہ ہر زمانہ میں آسمانی کتابوں کے ساتھ معلمین کتاب یعنی انبیاء علیہم السلام اور انبیاء کے بعد اولیاء کرام اور حواریوں کی ذوات بھی بھیجی جاتی رہی ہیں تاکہ وہ قانون کو پڑھ کر بھی سنائیں اس کے معانی و مطالب بھی سمجھائیں اس پر عمل کر کے نمونۂ عمل بھی دکھلائیں اور اس کو صحیح صحیح سمجھنے کا لوگوں میں ذہن بھی بنائیں جس سے دینی فہم اور ایمانی ذوق کی شخصیتیں بنی رہیں جیسا کہ قرآن نے اسے کافی کھول دیا ہے یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔

اس سے صاف واضح ہے کہ دین میں قانون کی ساتھ سلسلہ بسلسلہ قانونی اور دینی شخصیتیں بھی ضروری ہیں کہ ان کے بغیر نہ دین کی تاریخ بن سکتی ہے نہ اس تاریخ کے بغیر دین سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی زیر عمل ہی آ سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب اسلامی اصول کی رو سے کلام الٰہی کے بعد کلام پیغمبر اور کلام پیغمبر کے بعد کلام اولوالامر یا راسخین فی العلم کی اطاعت ضروری ہے جس پر قرآن شاہد ہے تو اس سے قدرتی طور پر اسلام میں چار حجتیں پیدا ہو گئیں جو اسلامی احکام کا ماخذ اور سرچشمہ مانی گئیں۔ کتاب اللہ (کلام الٰہی) سنت رسول اللہ (قول و فعل نبوی) اجماع امت (راسخین فی العلم کا کسی شرعی امر پر اتفاق) قیاس مجتہد (راسخین فی العلم کا قرآن و حدیث سے کسی

مسئلہ کا استخراج اور استنباط واجتہاد) شریعت اسلام میں کتاب وسنّت دونوں اپنے اپنے درجہ کے مطابق وحی مانی گئی ہے جس سے احکام شریعت ثابت بھی ہوتے ہیں اور نکلتے بھی ہیں۔ اجماع کا فعل وحی نہیں مگر رجوع اسکا وحی ہی کی طرف ہے کہ وہ کتاب سنت سے ثابت شدہ چیز ہی پر ہوتا ہے اسلئے اول کی تین حجتیں (کتاب وسنت اور اجماع) اصلی ہیں جس سے شریعت بنتی ہے اور آخر کی حجتؔ یعنی قیاس جو وحی کے مضمرات کا انکشاف اور اسی کے اجمال کی تفصیل ہے مگر اس میں مجتہد کی رائے کا دخل بھی ہوتا ہے۔ اس لئے اسے تفریعی حجۃ ماما گیا ہے جس سے شریعت بنتی نہیں صرف کھلتی اور تفصیلی ہو جاتی ہے لیکن بہر حال وہ اپنے درجہ ہی میں سہی ہے شرعی حجت مسائل کی بحث سے پہلے بطرِ اصول موضوعہ پہلے یہ بات عرض کر دینی ضروری ہے کہ اس تفصیل سے میری غرض یہ ہے کہ اسلامی مسائل میں اگر کوئی مسلم یا غیر مسلم کسی اسلامی دلیل سے حجت کا مطالبہ کرے تو اُسے بلاشبہ مطالبہ دلیل کا حق ہے لیکن دلیل دینے والا اگر اسلام کی چار مشہور حجتوں کتاب اللہ سنت رسول اللہ، اجماع امتؔ اور قیاس مجتہد میں سے کوئی ایک حجت بھی پیش کر دے تو اس نے سائل کا مطالبہ پورا کر دیا اور اس صورت میں سائل کا فرض ہوگا کہ اُسے بحیثیت دلیل کے تسلیم کرلے۔ اسے کسی دلیل خاص کے مطالبہ کا حق نہ ہوگا کہ فلاں مسئلہ قرآن ہی سے ثابت کیا جائے یا حدیث ہی سے اس کی دلیل دی جائے یا اجماع وقیاس ہی سے اسمیں حجت پیش کی جائے۔ بلکہ جواب دہندہ کا فرض صرف دلیل پیش کر دینے

سے ادا ہو جائیگا خواہ وہ کتاب سنت سے پیش کرے یا اجماع وقیاس سے
یعنی جونسی دلیل سے بھی یہ مسئلہ ثابت شدہ ہو وہی دلیل اس مسئلہ کے لئے
دلائی جانی کافی ہوگی اور حجت پیش کرنے کا حق ادا ہو جائے گا پھر بھی سائل
کو اس دلیل سے اطمینان نہ ہو تو اس دلیل یا اس کے مقدمات پر اعتراض کر سکتا
ہے لیکن اس کی حجت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے آپ نے جو اپنے سوالات
میں مجھ سے جگہ جگہ یہ مطالبہ کیا ہے کہ میں آپ کے سوال کا جواب قرآن ہی سے
دوں، اصولاً صحیح نہیں نہ آپ کو دلیل خاص کے مطالبہ کا حق ہے اور نہ
میں اصولاً اس فرمائش کی تعمیل کا پابند ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ اخلاقاً میں
آپ کے ہر سوال کا جواب قرآن ہی سے پیش کر دوں کہ یہ تبرع ہوگا فریضہ
نہ ہوگا۔

دوسری بات یہ گذارش کرنی ہے کہ دین کی تاریخ کے بارے میں
دین کی انہی ابتدائی شخصیتوں کی نقل وروایت اور فہم وفراست معتبر ہوگی
جو واقعات کو صرف سنکر ہی نہیں دیکھکر روایت کر رہے ہوں اور اول سے آخر
تک واقعات کے شاہد زبان کے ماہر اور اوپر سے تربیت یافتہ ذہن لئے
ہوئے ہیں ان سے الگ ہو کر دین کے بارہیں کسی کی رائے یا ذہنی تخیل سے
پیدا کردہ باتیں جو محض لفظوں کی آڑ لے کر نکالی گئی ہوں نہ دینی تاریخ
کہلائے گی اور نہ دینی معاملات کے لئے عقلاً یا نقلاً حجت سند ہونگی بلکہ ان
باتوں کا فیصلہ دین کی انہی مذکورہ قسم کی شخصیتوں کی نقل وروایت اور
فہم وفراست کے آثار سے کیا جائے گا۔

اگر مابعد کی کسی بھی شخصیت کی باتیں ان سلف کے اقوال سے ٹکرائیں گی تو دوبارہ منقولات و روایات دین کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔

پس آپ نے جو زیر نظر مسائل میں بسلسلۂ اعتراضات محض قرآنی الفاظ کی آڑ لیکر اور اس کی منقول تاریخ سے کٹ کر محض لفظوں کے ہیر پھیر سے جو واقعات کا ایک ڈھانچہ خود اپنی ذہنی روش سے تیار کیا ہے وہ مسئلہ کی منقول تاریخ کی حیثیت نہیں رکھتا چہ جائیکہ اس پر مبنی شدہ اعتراضات و شبہات قابل توجہ ہوں۔ کیوں کہ قرآن کے اس مفہوم خاص پر آپ کا اعتراض جو آپ کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ درحقیقت قرآن و حدیث یا اسکی تاریخ پر اعتراض نہیں بلکہ خود اپنے اوپر ہے جبکہ قرآن و حدیث کا یہ مفہوم خود آپ ہی نے لفظوں کی آڑ لیکر بنا لیا اور اس کے اس منقولہ مفہوم سے قطع نظر کر لی جو دینی شخصیتوں کی ثقہ روایتوں سے دینی تاریخ کے طور پر منقول ہوتا چلا آرہا ہے۔ بنا بریں آپ کے اعتراضات کی کوئی صحیح بنیاد ہی قائم نہیں ہوتی کہ ان کے جواب کی طرف توجہ کی جائے جبکہ وہ خود آپ ہی کی بنائی ہوئی تاریخ سے پیدا ہوئے ہیں نہ قرآن کی نقل شدہ تاریخ سے۔ اس لئے غور کیا جائے تو یہ اعتراضات آپنے خود اپنے ہی اوپر کئے ہیں نہ قرآن پر، اس لئے قرآن والوں پر ان کی جواب دہی کا وظیفہ عائد نہیں ہوتا۔ بلکہ خود آپ ہی کے اوپر یہ ضروری ہوتا ہے کہ سوال و جواب سے پہلے آپ خود اپنے نقطۂ نظر پر نظر ثانی فرمائیں کہ آپ کس پر اعتراضات کر رہے ہیں بہرحال حجت طلبی کے سلسلہ میں آپ اصولاً دلیل خاص طلب کرنے کے بھی

مجاز نہیں کہ قرآن ہی سے ثبوت پیش کرنے کی فرمائش کریں اور تاریخ یا امور منقولہ کے بارے میں اسلامی نقول اور سلف کی روایات سے الگ ہو کر آپ خود سے تاریخ بنانے یا اپنے مفہوم کو تاریخ رکھنے کے بھی مجاز نہیں۔ اسلئے نہ مجھ پر آپ کے مطالبہ کے تحت آپ کے ہر شبہ کا جواب قرآن سے دینا ضروری ہے اور نہ روایات میں آپ کے ذہنی اختراعات کو تاریخ تسلیم کرنا ضروری ہے

اس تمہید کے ذریعہ آپ کے اعتراضات کی نوعیت آپ کے سامنے لاکر اور خود کو آپ کے بے اصول مطالبہ سے آزاد کر کے اخلاقاً گذارش کرتا ہوں کہ اب میں محض آپ کی خاطر سے اخلاقاً آپ کے تمام سوالات و شبہات کو قابل سماعت فرض کر کے قرآن حکیم ہی کی روشنی میں اُن پر غور کرتا ہوں اور آپ کے غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اسی اصول پسندی سے جس کا آپ نے گرامی نامہ میں مظاہرہ کیا ہے اپنی خیالی تاریخ سے الگ ہو کر محض قرآن کی مستند تاریخ کی روشنی میں شبہات و جوابات پر غور کریں گے اور دیانتاً جوبات سمجھ میں آجاوے اسے قبول کر لینے اور قبولیت کی اطلاع دینے میں کوئی پس وپیش نہ فرمائیں گے۔ واللّٰہ یھدی من یشآء الی صراط مستقیم :-

اس مختصر سی تمہید کے بعد میں آپ کے اعتراضات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو آپ نے اسلام کے نظام اخلاق پر کئے ہیں آپ نے اپنے پہلے گرامی نامہ میں اسلام پر طعن و تشنیع کرتے ہوئے خصوصیت سے اس کے معیار

اخلاق کے بارے میں فرمایا تھا کہ اسلام میں اخلاق کا کوئی معیار ہی نہیں اور نہ ہی ہمیں اعلیٰ اخلاق کی کوئی تعلیم دی گئی ہے۔ اس پر میں نے جواب عرض کیا تھا کہ دنیا میں اگر کسی مذہب نے اخلاق کا مکمل معیار پیش کیا ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہے کیوں کہ اس نے اخلاق کے ایک دو نہیں بلکہ ننانوے اصول پیش کئے ہیں جنھوں نے اپنی ہمہ گیر جامعیت کے دائرہ میں انسانی اخلاق کے تمام گوشوں اور پہلوؤں کو گھیر لیا ہے اور پوری انسانی زندگی کو اخلاقی بنا دیا ہے۔

(۱) اس پر آپ نے اپنے اس دوسرے گرامی نامہ میں جو اس وقت میرے سامنے کھلا ہوا ہے بدستور اسلام میں سے اخلاقی معیار کی کلی نفی کرتے ہوئے مجھ سے مطالبہ کیا ہے کہ میں اپنے دعوئی کردہ ننانوے اصول اخلاق کا قرآن سے ثبوت پیش کروں، کم از کم دو چار ہی مثالیں قرآن سے پیش کر دوں۔

(۲) پھر اسی گرامی نامہ میں آپ نے اسلام کے نظام اخلاق کی پستی اور گراوٹ کا دعوئی کرتے ہوئے حضرت زید بن حارثہ کی بیوی زینب رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کو قرآن سے بطور ثبوت پیش کیا ہے کہ یہ بے مالک کی بیوی سے نکاح معاذ اللہ بمنزلہ زنا کے ہے جسے اسلام نے جائز رکھکر عیاذاً باللہ زنا و فحش کا دروازہ کھولدیا ہے جو بداخلاقی کا نظام ہے نہ کہ اخلاق کا۔

(۳) پھر اس گرامی نامہ میں اسلامی اخلاق کی پستی اور بے مائگی کے ثبوت

میں بخاری کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر غفاری کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا وہ جنت میں داخل ہوا اگرچہ وہ زنا کرے اور چوری کرے۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ اس حدیث نے زانیوں اور چوروں کو جنتی بنا کر زنا اور چوری جیسے جرائم کی پشت پناہی کی ہے اور اُن کو فروغ پانے کا دروازہ کھولدیا ہے جس سے اسلامی اخلاق کی پستی واضح ہے۔

پھر اسی گرامی نامہ میں اسلام کو ایک جبری مذہب بتلاتے ہوئے آپ نے قرآن کے سر رکھ کر دعویٰ کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے اپنے کو منواتا ہے اس میں خود کوئی اخلاقی کشش نہیں ہے جو مخلوق کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ اس لئے ایسے مذہب کو اخلاق کے نظم سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

ان چاروں نمبروں کا خلاصہ اور آپ کا منشا یہ ہے کہ اسلام میں اخلاق کا کوئی اونچا معیار موجود نہیں بلکہ اس میں بد اخلاقی کے جرائم کے دروازے کھلے ہیں اور اسی لئے اسے اپنے کو منوانے کیلئے تلوار اٹھانی پڑی کہ خود میں کوئی اخلاقی روح نہ تھی جو دنیا کو اپنی طرف کھینچ سکتی۔

اب میں نمبروار آپ کے سوالات و شبہات کو لیتا ہوں۔

پہلا شبہ اور اس کا جواب

(۱) نمبر ایک کے سلسلے میں آپ نے اس زیر نظر والا نامہ میں اس خاکسار کو

خطاب کرتے ہوئے پہلا شبہ ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے کہ آپ نے (راس خاکسار نے) قرآنی اخلاقی معیار کی گنتی ننانوے تو ضرور فرما دی لیکن آپ نے یہ نہ فرمایا کہ وہ کون سے ہیں؟ اور نہ ہی آپ نے ان کا قرآنی حوالہ فرمایا کہ وہ قرآن میں کونسی سورت میں مندرج ہیں؟ میں نے تو آپ کو مسیحی اخلاقی معیار کے دس احکام عرض کر دئے تھے اور دس احکام میں سے تین چار کو تحریر بھی کر دیا تھا کہ "تو چوری مت کر" "تو خون مت کر" "تو زنا مت کر" لیکن قرآنی ننانوے کی گنتی کے علاوہ میں یہ جاننے سے قاصر رہا کہ وہ ننانوے کونسی ہیں؛ کم از کم پانچ سات تو ضرور ہی تحریر فرما دیجئے گا"

اس عبارت میں آپ نے بائبل کے دس باتوں کو بطور "معیار اخلاق" پیش کرتے ہوئے اسلام سے معیار اخلاق کی نفی کی ہے اور کہا ہے کہ اسلام نے اخلاق کا کوئی معیار ہی پیش نہیں کیا (کیونکہ اس نے ان معاصی سے کہیں روکا نہیں ہے۔

میں آپ کے مدعا کے جزاول کو "بائیل نے یہ دس باتیں بطور اخلاق کی نہیں" سامنے رکھکر پہلی بات تو یہ گزارش کروں گا یہ بائیل کے پیش کردہ دس امور نہ معیار اخلاق ہیں اور نہ معیار اخلاق بن سکتے ہیں کیونکہ یہ دس باتیں کہ مثلاً "تو چوری مت کر" "تو زنا مت کر" "تو خون مت کر" از قسم افعال ہیں جن کا تعلق کرنے نہ کرنے سے ہے از قسم اخلاق نہیں جو قلب کے خلقی مادے ہیں اور اس میں بصورت تخم پیوست ہوئے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ تخم سے تو شاخیں پھوٹتی ہیں شاخوں سے ان کا تخم نہیں بنا کرتا

بدیں وجہ افعال تو اخلاق سے سرزد ہو سکتے ہیں لیکن اخلاق اپنے افعال سے نہیں نکل سکتے۔ خلق سخاوت سے داد و دہش کا فعل نکلتا ہے اس فعل کا خلق سخاوت پیدا نہیں ہوتا۔ شجاعت کے خلق سے حملہ آوری کا فعل نمایاں ہوتا ہے۔ حملہ آوری سے شجاعت کا خلق نہیں بنتا۔ خلق حیا سے کسر نفسی اور تواضع نمایاں ہوتی ہے کسر نفسی سے حیا کا خلق تیار نہیں ہوتا۔ خلق قناعت سے زہد کا قوام بنتا ہے زہد سے قناعت نہیں بنتی۔ خلق شکر سے اعتراف و منت پذیری کا فعل نمایاں ہوتا ہے اعتراف سے شکر کا مادہ پیدا نہیں ہوتا خلق صبر سے ضبط نفس کے افعال تسلیم و رضا ظاہر ہوتے ہیں، تسلیم و رضا سے خلق صبر پیدا نہیں ہوتا۔ غرض قلب میں اگر افعال کا کوئی تبلیغی مادہ نہ ہو تو فعل سرزد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے افعال کا منشا اور سرچشمہ درحقیقت قلب کے لئے یہی مادے صبر۔ شکر۔ سخاوت۔ شجاعت مروت۔ غیرت۔ حیا۔ وغنا وغیرہ ہیں جن کا نام اخلاق ہے اس لئے اخلاق اصول ثابت ہوتے ہیں۔ جس کا تعلق قلب سے ہے اور افعال ان کے آثار ہیں جن کا تعلق ظاہر بدن اور اعضا رجسمانی سے ہے پس اخلاق بمنزلہ تخم اور جڑ کے ہیں اور افعال بمنزلہ شاخوں اور پتیوں کے ہیں اور کون نہیں جانتا کہ پھول پتیاں تو جڑ سے بنتی ہیں۔ جڑ پھول پتیوں سے نہیں بنتی۔ اس لئے یہ مسئلہ بھی صاف ہو جاتا ہے کہ جڑ تو پھول پتیوں کے اچھے برے ہونے کا معیار ہو گی پھول پتی جڑ کے اچھے برے ہونے کا معیار نہیں بن سکتی۔ اس اصول پر افعال کی بھلائی برائی تو اخلاق

کی بھلائی برائی کے تابع ہو گی مگر قصہ بر عکس نہ ہو گا کہ اخلاق کی بھلائی برائی افعال کے تابع ہو جائے۔ اس لئے اخلاق کو تو افعال کی خوبی وخرابی کا معیار کہا جائیگا کہ جیسے اخلاق ہوں گے ان سے اعمال سرزد ہوں گے لیکن افعال کو اخلاق کی برائی بھلائی کے حق میں معیار شمار نہیں کیا جائیگا کہ جیسے افعال ہوں ویسے ہی اخلاق بن جایا کریں۔ اندریں صورت آپکا چوری زنا خون وغیرہ سے بچنے کے افعال کو معیار اخلاق کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص شاخوں کو تخم کے اچھے برے ہونے کا معیار بتلانے لگے جو عقل ہی کی نہیں نگاہ کی بھی غلطی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ افعال کو اخلاق کو اچھے برے ہونیکی علامت کہدیا جائے کہ ان کی برائی دیکھکر اخلاق کی برائی کو سمجھ لیا جائے یا افعال کے تکرار سے متعلقہ اخلاق کو ابھار دیا جائے اور مضبوط بنا دیا جائے لیکن یہ ممکن نہیں کہ افعال کو اخلاق یا معیار اخلاق کہدیا جائے اور کہا جائیگا تو یہ اصل وفرع کے باہمی علاقہ سے بے خبری اور لاعلمی کے علامت ہو گا۔

بلکہ اگر اور گہری نظر سے کام لیا جائے تو آپ کی نقل وروایت کے مطابق بائبل کے یہ ممنوعہ افعال "معیار اخلاق" تو کیا ہوتے معیار احکام بھی نہیں کہ ان کے مجموعہ کو معیاری قانون یا اصولی ضابطہ ہی کہدیا جائے کیوں کہ معیاری قانون سے معنی یہ ہیں کہ وہ احکام کے ساتھ ان احکام کے بنیادی اصول وکلیات پر بھی مشتمل ہو جن سے یہ احکام جزئیہ نکلے ہوئے ہیں یہ ہی اندرونی اصول وکلیات جن سے ان احکام نے جنم لیا ہے ان احکام

کی علت کہلاتے ہیں جن کے ہونے نہ ہونے پر حکم کا دارمدار ہوتا ہے۔ یہ علت پائی جاتی ہے تو حکم بھی پایا جاتا ہے۔ نہیں پائی جاتی تو حکم بھی مرتفع ہو جاتا ہے بائبل کے ان دس احکام کے بارے میں بائبل کی جو تعبیر آپنے پیش کی ہے کہ "تو خون مت کر" "تو زنا مت کر" "تو چوری مت کر" اس سے حکم تو معلوم ہو جاتا ہے کہ زنا چوری قتل حرام ہے لیکن معیار حکم کی اس سے نشان دہی اشارۃً بھی نہیں ہوتی کہ آخر ان باتوں کی ممانعت کی بنیاد کیا ہے اور ان امور میں یہ برائی اور قباحت خود اپنی ہے یا کہیں باہر سے آئی ہے اور آئی تو کہاں سے آئی ہے جس کی وجہ سے یہ ممنوع قرار دیئے گئے؟ بالفاظ دیگر ان افعال کی حرمت کی علت کیا ہے جس نے ان میں حرمت کے آثار پہنچائے ہیں کہ وہ علت ہی درحقیقت معیار حکم ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کلی علت کا پتہ چل جائے جو حکم کا مدار اور معیار ہے تو یہ علت جہاں جہاں بھی پائی جائیگی یہ حکم بھی وہاں وہاں منتقل ہوتا رہے گا کیوں کہ یہ علت ہی فعل کی اچھے برے ہونے کا معیار تھی جس سے فعل میں برائی آئی تھی۔ پس اصل میں بری یہ علت ہوتی ہے خود فعل اپنی ذات سے برا نہیں ہوتا۔ اس لئے جہاں بھی اور جس فعل میں بھی یہ علت پائی جائیگی وہیں اس کی برائی بھی ساتھ ہی پہونچ جائے گی وہی حکم اس دوسرے فعل پر بھی لگ جائے گا جو پہلے فعل پر لگا ہوا تھا خلاصہ یہ کہ فعل کے اچھے برے ہونے کا معیار یہ علت ہوتی ہے اور علت کے اچھے برے ہونے پر حکم کی نوعیت موقوف ہوتی ہے اگر

علت حکم اچھی ہے تو حکم اجازت کا ہو جائے گا اور اگر علت بری ہے تو حکم ممانعت کا لگ جائے گا اس لیے حکم کی نوعیت بالآخر علت حکم کی نوعیت پر دائر ہے جو حکم کیلئے روح اور جڑ کا درجہ رکھتی ہے ظاہر ہے کہ اس طرح ان کلیاتی علتوں کے ہوتے ہوئے ایک جزئی حکم بھی ایک کلی ضابطہ اور ایک وسیع اور معیاری قانون بن جاتا ہے جس سے کسی ایک ہی فعل کا نہیں بلکہ اس جنس کے کتنے ہی افعال کا محض علت کی وجہ سے فیصلہ ہو جاتا ہے۔ محض جزیات منفردہ کا نام قانون یا ضابطہ نہیں ہوتا اور خواہ مخواہ رکھ لیا جائے تو وہ قانون معیاری اور اصولی نہیں کہلایا جا سکتا۔

معیار قانون کے اس ضابطہ کو سامنے رکھ کر زنا چوری خون وغیرہ کا معیاری قانون دیکھنا ہو تو وہ یہ نہیں ہو سکتا کہ تو چوری مت کر" تو زنا مت کر" تو خون مت کر" کہ یہ منفرد جزئیات اور ان کے احکام میں جس میں ان جزئیات کا کوئی منشا اور کوئی کلی اصول ہی سامنے نہیں آتا جس کی رو سے یہ "مت کر" کا حکم کوئی با اصل معقول اور معیاری حکم سمجھا جائے معیاری قانون اگر دیکھنا ہے تو وہ ہے جو ان ہی حکام کے بارے میں قرآن حکیم نے بتلایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے جزی حکم کیساتھ اس کی جامع علت اور علت و حکم کا درمیانی رابطہ دکھلا کر اسے معیاری قانون بنا دیا ہے۔ چنانچہ یہی زنا چوری خون وغیرہ کے احکام جب قرآن نے بیان کئے تو صرف ان کا حکم ہی نہیں سنا دیا بلکہ اپنی حکیمانہ اسلوب بیان سے اس حکم کی علت پر بھی روشنی ڈالی جو اس حکم کا معیار تھا جس سے یہ حکم ایک وسیع ضابطہ

بن گیا اور اس ایک ہی حکم سے کتنے ہی حوادث کا حکمی فیصلہ ہو گیا جو اس علت کی نشاندہی کا ثمرہ ہے مثلاً ممانعت زنا کے بارے میں قرآن نے صرف یہ نہیں کہدیا کہ "تو زنا مت کر" بلکہ یہ فرمایا کہ

ولا تقربوا الزنا انہ فاحشۃ	تم زنا کے پاس بھی مت پھٹکو کیوں کہ وہ
وساء سبیلا۔ (سورۂ بنی اسرائیل)	فحش (بے حیائی) ہے اور بری راہ ہے

اس آیت کریمہ میں زنا سے روکتے ہوئے اس کی بنیادی علت پر بھی تنبہ کیا کہ وہ فحش اور سوء سبیل ہے جو اس کی ممانعت کا معیار ہے کہ اسی کی وجہ سے اس فعل میں حرمت پیدا ہوئی ہے اگر قلب میں فحش کے بجائے عفت (پاکدامنی) ہو اور راستہ سیدھا سامنے ہو جو خدا کی بتلائی ہوئی راہ ہے مثلاً نکاح یا ملک رقبہ کا راستہ ہو یعنی باندی پر قبضہ تو پھر یہی فعل بجائے حرام ہونیکے حلال ہو جاتا ہے اس سے واضح ہوا کہ خود یہ فعل اپنی ذات سے نہ برا ہے نہ ممنوع، فحش اور سوء سبیل نے اس میں ممانعت کا حکم پہونچایا ہے۔

اس لئے اس آیت میں حکم زنا کے ساتھ ساتھ اس کا معیار بھی ذکر کیا گیا ہے کہ وہ فحش اور سوء سبیل ہے یعنی بے حیائی اور بے راہی اندریں صورت اس قرآنی حکم کو معیاری حکم کہیں گے نہ کہ انجیلی حکم کو کہ جس میں صرف ممانعت مذکور ہے معیار کا پتہ نہیں اور جب کہ یہ علت ہی معیار حکم ہے اور وہ انجیل میں ندارد ہے تو یہ انجیلی حکم معیار اخلاق تو کیا ہوتا معیار احکام بھی نہیں جبکہ اس میں حکم اخلاق پر نہیں یعنی صرف فعل پر ہے علۃ فعل پر نہیں جس سے یہ حکم معیاری بنتا تھا۔

نیز اسی آیت سے جبکہ یہ بھی واضح ہوگیا کہ اس فعل کی ممانعت میں فعل زنا اصل نہیں بلکہ فحش اصل ہے تو حقیقتاً ممانعت فحش کی ہوئی اس کے ضمن میں زنا کی بھی ہوتی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ فحش ممنوع جس فعل میں بھی پایا جائے گا وہ فعل بھی بضمن فحش درجہ بدرجہ ممنوع ہوتا چلا جائے گا جیسے اجنبی عورت پر نگاہ ڈالنا اسکی طرف بری نیت سے چل کے جانا اُسے ہاتھ لگانا اس کے احوال کی تگ و دو کرنا حتیٰ کہ دل میں اس کے خیالات پکانا وغیرہ فحش کے افعال تھے تو ممنوع قرار دیدیے گئے چنانچہ اِس فحش پر مبنی کر کے اسلام نے پردہ کا سسٹم جاری کیا اور اسی لئے عورت کے سارے جسم کو گردن سے لیکے ٹخنوں تک سترِ عورت قرار دیا اور اسی لئے حدیث نبوی میں نگاہ بازی کو آنکھ کا زنا قرار دیا گیا جس سے غضّ بصر یعنی نگاہیں نیچی کر لینے کا حکم دیا گیا اور ایسے ہی اجنبیہ کو چھونا ہاتھ کا زنا ٹھیرا اور اس لئے اسکی طرف اس نیت سے چلنا پیر کا زِنا ہوا وغیرہ وغیرہ پس فحش کی علت کی بنا پر ایک زنا ہی حرام نہیں ہوا بلکہ وہ سارے افعال بھی ممنوع ہوگئے جن کو فحش و بے حیائی نے ابھارا ہو اور جن کو شریعت اِسلام کی اصطلاح میں دواعی زِنا کہا گیا ہے۔ پس اس ایک حکم زنا سے ایک ہی آیت کی بدولت بے حیائی کے ہزاروں افعال حرام ہوگئے جو درحقیقت بیان معیار کا اثر ہے۔

قرآن کے اس طرز بیان سے نکل آیا کہ فحش ہی وہ برا مادہ ہے۔ جس سے زِنا کا دروازہ کھلتا ہے خود زنا کوئی مادہ نہیں ورنہ ممانعت زِنا

ایک جزدی حکم ہے جو خود سے اور جزئیات پر نہیں پھیل سکتا تھا جسے آپ خلق سمجھے ہوئے ہیں بلکہ اس مادہ سے سرزد شدہ ایک فعل ہے جسے یہ مادہ ابھارتا ہے پس انجیل نے صرف ایک فعل کی ممانعت کی اور قرآن نے اس کے منشا رکی ممانعت کرتے ہوئے اس کا اصولی سلسلہ بھی بتلا کر ممنوع قرار دیدیا جس سے فحش کے ممنوعات کا ایک مرتب علمی سلسلہ سامنے آگیا اور یہی ایک سلسلہ کا اپنی اصولی وسعتوں کے لحاظ سے معیاری نظام ہے جس کی نشاندھی اس آیت کریمہ نے کی۔ جس سے بے حیائی کا نظام مٹ کر حیاداری کا نظام قائم ہوجاتا ہے۔ اب اندازہ کیجئے کہ انجیل کے اس جزدی حکم پر کہ "تو زنا مت کر" اخلاقی نظام یا اخلاقی معیار کا اطلاق آسکتا ہے یا قرآن کے اس مذکور اصولی اور جامع حکم پر جس نے فواحش کی۔ ممانعت کا اصولی سلسلہ پیش کرکے کتنی ہی فروعات فحش کا حکم اسی ایک آیت سے بتلا دیا اور زنا کو ناتمامی کے ساتھ نہیں روکا بلکہ مکمل طریق پر مع اس کے دواعی اور محرکات کے روک دیا۔ اور کیا اس کے بعد بھی جناب کو یہ کہنے کا حق ہوگا کہ اسلام نے اخلاق کا کوئی معیاری نظام پیش نہیں کیا۔

اسی طرح آپ کی نقل کے مطابق چوری جیسے قبیح فعل کی بابتہ بائبل نے کہا کہ "تو چوری مت کر" لیکن قرآن نے چوری کی ممانعت کا وہ اسلوب اختیار کیا کہ چوری ممانعت کے ساتھ اس کے سدباب کا وہ اصولی راستہ بھی سامنے آجاتا ہے جس سے چوری جیسے اور بہت سے

منکرات کا خاتمہ ہو جائے بلکہ ان منکرات کا وہ اخلاقی جذبہ ہی دل سے نکل جائے جس سے چوری جنم لیتی ہے۔ فرمایا۔

والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما جزاءً بما کسبا نکالاً من اللہ واللہ عزیز حکیم فمن تاب من بعد ظلمہ واصلح فان اللہ یتوب علیہ ان اللہ غفور رحیم = (پارہ ۶ سورۂ مائدہ)	اور جو مرد چوری کرے اور جو عورت چوری کرے سو ان دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو انکے کردار کے عوض میں بطور سزا کے اللہ کیطرف سے اور اللہ تعالیٰ بڑی قوت والے ہیں (جو سزا چاہیں مقرر فرمائیں) بڑی حکمت والے ہیں (کہ مناسب ہی سزا مقرر

کرتے ہیں) پھر جو شخص (موافق قاعدہ شریعت کے) توبہ کرے اپنی اس زیادتی (چوری) کرنے کے بعد اور (آئندہ کیلئے درستی رکھے (چوری نہ کرے) تو بیشک اللہ تعالیٰ اسپر توجہ فرمادینگے بیشک خدا تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں چوری کو ظلم سے تعبیر کرکے اس کے معیار پر بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ ظلم ہے جس سے آدمی غیر کے محفوظ مال پر بلا اس کی مرضی کے دست اندازی کرتا ہے پس بلحاظ حقیقت چوری کا فعل ممنوع نہیں بلکہ ظلم ممنوع ہے۔ ظلم چونکہ چوری میں پایا جاتا ہے اس لئے چوری بھی ممنوع ٹھہر گئی جس سے نمایاں ہو گیا کہ ممانعت میں چوری اصل نہیں بلکہ ظلم اصل ہے جس کے تابع ہو کر چوری ممنوع ثابت ہوئی۔ اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ اگر چوری کے فعل میں ظلم کا دخل نہ ہو بلکہ اس کی ضد عدل کا دخل ہو جائے تو چوری ممنوع نہ رہیگی اور پھر اسے چوری نہیں کہیں گے۔ مثلاً اگر کوئی

ظالم کسی کا مال چرا کر لیجائے اور مظلوم کو علم ہو جائے کہ میرا مال فلاں کے یہاں فلاں جگہ چھپا ہوا رکھا ہے جسے وہ دینا نہیں چاہتا تو وہ اپنا مال چرا کر بھی نکال لا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں چوری کا فعل تو پایا گیا کہ مال محفوظ کو آنکھ بچا کر بے خبری کیساتھ بلا رضا قابض نکال لایا گیا لیکن ظلم نہ پایا گیا جبکہ ایک شخص نے اپنی جائز شئے ناجائز قبضہ سے نکال لی۔ اس لئے یہ فعل بھی ممنوع نہ رہا۔ ظاہر ہے کہ جب ممانعت میں ظلم اصل ہے تو جس جس فعل میں مالی ظلم پایا جائے گا وہی فعل اپنے درجہ کی حد تک ممنوع ٹھہرتا چلا جائیگا جیسے مال کی تاک جھانک بھید لینا، نقب لگانا، کمند چڑھانا اور اس حرکت کے لئے پارٹی بنانا یا بلا عوض مال جھپٹ لینا وغیرہ کہ یہ سب مظالم ہی مظالم ہیں۔

پس اس آیت کریمہ نے ایک چوری ہی کی ممانعت نہیں کی بلکہ اسکا معیار بتلا کر ہزاروں ظالمانہ اور غاصبانہ افعال کو ممنوع ٹھیرا دیا جس سے عدل کا نظام قائم ہو جاتا ہے اور ظلم کا کارخانہ درہم برہم ہو جاتا ہے تو اس اعجازی بیان سے معیاری احکام ثابت ہو سکتے تھے جو قرآن نے پیش کیا۔ یا انجیل کے اس طرز بیان سے کہ "تو چوری مت کر"

غور کیا جائے تو قرآن کریم نے اپنے اس اسلوب بیان میں جو چوری کی ممانعت میں پیش کیا ہے نہ صرف حکم اور اس کی علت ہی پر متنبہ کیا ہے بلکہ دل میں اس ظالمانہ فعل کی نفرت بٹھلا دینے کے بھی متعدد پہلو کھول دئے ہیں مثلاً چوری کو ظلم کہہ کر تو اس کی برائی دل میں بٹھلائی

ہاتھ کاٹنے کی سزا دیگر جو رسوائی اور فضیحتی برملا کر دی کہ ہاتھ کٹا ہوا دیکھکر وہ برابر دل میں خجل ہوتا رہے جس سے آئندہ چوری کا جذبہ ہی مضمحل ہو جاتا ہے پھر اس سزا کو خدائی سزا کہہ کر ادھر بھی اشارہ کر دیا کہ یہ سزا جو شرعی ہے جو کسی کے معاف کئے معاف ہونے والی بھی نہیں کہ اس میں کسی کی سعی سفارش چل جائے جس سے چوری کا غیر معمولی خوف بھی دل میں بٹھلا دیا۔

پھر اس کٹے ہوئے ہاتھ کی سزا کو عمر بھر گلے کا ہار بنا کر چوری کا آلہ بھی ختم کر دیا جس سے آئندہ چوری کے فعل کا سرزد ہونا بھی مشکل بنا دیا۔

پھر اس برملا اور علانیہ مظاہرہ کی سزا کو ایک کھلی عبرت ہی بنا دیا کہ اس کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھکر ہر دیکھنے والے کے دل میں چوری سے خوف اور دور رہنے کا جذبہ پیدا ہو جو ایک عمومی درس عبرت ہے اور ایک عظیم اخلاقی تربیت ہے یا بالفاظ دیگر چوری کی یہ دوامی سزا پبلک حقوق کی ایک عمومی حفاظت ہے جس سے اصولاً منکرات کا دروازہ بند ہو جاتا ہے

نیز اسی کی ساتھ اس چور کے ہاتھوں مال سے محروم ہو جانے والوں کے لئے سامان تسلی بھی ہے کہ اگر ان کا مال گیا تو چور کا وہ ہاتھ بھی ساتھ چلا گیا جس نے ان کے دلوں کو دکھ پہنچایا تھا۔

غرض چوری کے حکم ممانعت کے ساتھ اس کی اتنی قباحت اور قباحت کے ساتھ چوری کی اس سزا میں اتنی غیر معمولی مصالح کا سمو دیا جانا اور اس کی ساتھ اس کے اندرونی علّت پر مطلع کر کے چوری کی نوع دوسرے مالی مظالم کا بھی سدباب کر دیا جانا جس میں چوری کی

انتہائی مذمت چور کے لئے دوامی خجالت سزائے چور کی مداومت فعل چوری سے ۔ خوف مخلوق کیلئے دوامی عبرت اور اصولی الفاظ میں اس سزا سرقہ میں اصلاح نفس، اصلاح خلق، حقوق خالق اور ان کے تحفظ کے طبعی وسائل وغیرہ سب ہی کی رعایت موجود ہے اگر قرآن کی طرز بیان کی بلاغت جامعیت اعجازی فصاحت نہیں ہے تو اور کیا ہے جس کی رُو سے یہ قرآنی حکم حکم محض نہیں رہا بلکہ معیاری قانون اور مالیات کا ایک معیاری ضابطہ ثابت ہوتا ہے جس کی توقع یقیناً اس طرز بیان سے نہیں کیجا سکتی کہ "تو چوری مت کر"

پس کہاں انجیل کا یہ طرز بیان کہ "تو چوری مت کر" اور کہاں قرآن کا یہ انداز فرمان کہ چوری کی ممانعت کے ساتھ اس کی ذاتی قباحت اس کے آثار بد اور اس سے پیدا شدہ فساد اخلاق وغیرہ سارے ہی متعلقہ امور کی طرف توجہ دلا کر اس کے سدباب کی مادی اور اخلاقی دونوں قسم کی صورتیں حکم ہی میں بتلادی گئیں جس سے پورے مالیات میں سے بداخلاقی کا نظام مٹ کر معاشرہ کا اخلاقی نظام قائم ہوجاتا ہے ۔ لیکن الزام پھر بھی اسلام ہی پر ہے کہ اس نے اخلاق کا کوئی معیار اور نظام ہی نہیں بتلایا گویا فقط انجیل نے بتلایا ہے جس کی کیفیت الہی آپ کے سامنے عرض کردی گئی ۔

اسی طرح قتل نفس کے بارے میں آپ نے انجیل کا یہ حکم نقل کیا ہے کہ "تو خون مت کر" ظاہر ہے کہ اس سے حفظ جان کا کوئی اصول

اصول سامنے آتا ہے نہ نظام تحفظ کا کوئی اسلوب کار صرف ایک فعل کی ممانعت ظاہر ہو جاتی ہے بخلاف قرآن حکیم کے کہ اس نے یہی حکم اس طرح ارشاد فرمایا کہ۔

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللّٰہ الا بالحق ومن قتل مظلوماً فقد جعلنا لولیہ سلطاناً فلا یسرف فی القتل انہ کان منصوراً۔

(پارہ سبحان الذی)

اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے اس کو قتل مت کرو ہاں مگر حق سے اور جو شخص ناحق قتل کیا جاوے تو ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے سو اسکے قتل کے بارے میں حد سے تجاوز نہ کرنا چاہیے وہ شخص طرفداری کے قابل ہے۔

قرآن نے یہاں بھی بیان حکم کی ساتھ ہی اظہار علت کا حقیقت نما اسلوب اختیار کیا اور بتلایا کہ حقیقتاً قتل نفس ممنوع نہیں بلکہ اسراف فی القتل یعنی قتل بے جا ممنوع ہے جس سے یہ قتل قتل ناحق ہو جاتا ہے اگر اسمیں اسراف فی القتل یعنی قتل کے ناحق ہونے کا دخل نہ ہو یعنی قتل میں ظلم اور حدود سے تجاوز یا اللہ کی نافرمانی شامل نہ ہو بلکہ حدود خداوندی کے اندر ہو اور بالفاظ دیگر فرمانبرداری کے تحت ہو جیسے ظالم قاتل کا قتل بصورت قصاص ہو۔ یا زانی کا قتل بصورت سنگساری ہو۔ یا مرتد کا قتل بصورت عدم توبہ ہو تو یہ اسراف فی القتل نہیں بلکہ عدل فی القتل ہے پس اس آیت نے واضح کر دیا کہ قتل کو معصیت بنانے والی روح بھی اسراف وتعدی ہے خون کرنے کا فعل اپنی ذات سے گناہ نہیں جو یہ

کہہ کر معاملہ ختم کر دیا جائے کہ "تو خون مت کر" بلکہ ظلم فی القتل گناہ ہے جو گنہ گاری کی روح ہے اس لیے قرآن نے یہ نہیں کہا کہ "تو خون مت کر" بلکہ خون کرنے کی دونوں نوع پر روشنی ڈالکر کہ ایک خون ناحق ہے جسے اسراف فی القتل یا ظلم فی القتل کہا جائے گا اور ایک خون برحق ہے جسے عدل فی القتل کہا جائے گا جس میں خدا کی طرف سے نصرت شاملِ حال ہوتی ہے سو خون ناحق کو ممنوع ٹھیرایا جس سے واضح ہو گیا کہ خون کرنا خود ممنوع نہیں بلکہ اس کا ناحق ہونا ممنوع ہے جس سے قتل کا قتل کے حق ناحق ہونے کا معیار نکل آتا ہے کہ وہ عدل ہے جس کی رُو سے قتل کے اچھے برے یا جائز و ناجائز ہونے کو پہچانا جائے گا۔

پس قتل کی یہ تفصیل اور اس کے معیار کا یہ ذکر ہی اس حکم کے فطری نظام کی نشاندہی ہے جس سے جزدی حکم معیاری بن جاتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ اسلام نے معیاری نظام پر کوئی روشنی ہی نہیں ڈالی انتہائی جسارت اور ظلم عظیم ہے۔

بہر حال آپ نے بائبل سے چونکہ یہ تین باتیں "تو خون مت کر" "تو چوری مت کر" "تو زنا مت کر" منجملہ دس باتوں کے بطور مثال کے پیش کر کے انجیل کے اخلاقی معیار پر استدلال کیا تھا اس لیے میں نے بھی قرآن حکیم کی دس ہی باتوں میں سے بھی تین مثالیں پیش کر دیں جو معاشرے کے اخلاقی نظام یا بقول آپ کے "معیار اخلاق" قائم کرنے کے لئے اسے پیش کی ہیں ورنہ ان ممنوعات کا سلسلہ یکجائی طور پر پندرھویں پارے کے تیسرے

رکوع سے شروع ہو کر چوتھے رکوع کے آخر تک چلا گیا ہے ان دور کوعوں میں قرآن نے دس باتوں نافرمانی والدین، رشتہ داروں مسکینوں اور مسافروں کی حق تلفی، فضول خرچی اور بخیلی، قتلِ ناحق، زناکاری، مالِ یتیم میں تصرف بیجا، بدعہدی، ناپ تول میں کمی جو چوری کی ذلیل ترین نوع ہے، بدگمانی، اور تکبر کی چال، کی ممانعت کرتے ہوئے آخر میں اعلان فرمایا۔

کل ذلك كان سيئه عند ربك مكروها۔ — یہ سارے برے کام تیرے رب کے نزدیک بالکل ناپسند ہیں۔

اب اگر آپ کے نزدیک دس برائیوں کو گنا کر ان کی ممانعت کر دینا ہی معیار اخلاق ہے جیسا کہ بائبل کے بارے میں آپ کا دعویٰ ہے تو آپ ہی کے اصول کے مطابق قرآن نے بھی دس ممنوعات گنا کر معیار کا معیار اخلاق قائم کر دیا ہے پھر آپ کو بائبل کے مقابلہ میں قرآن پر اس اعتراض کا حق کیسے پہونچتا ہے کہ اس نے اخلاق کا کوئی معیار ہی قائم نہیں کیا پھر انجیل نے تو آپ کی نقل کے مطابق احکام ہی سنائے ہیں لیکن قرآن نے دس باتوں کے احکام سنا دینے کیساتھ ساتھ اُن کی علتوں پر مطلع کر کے ان احکام کو معیاری قانون بھی بنا دیا ہے جس سے حکم اور حکم کی معتدل حدود اور نوعیتوں پر بھی پوری پوری روشنی پڑ جاتی ہے جس سے ان میں کا ایک ایک حکم نہ صرف حکم بلکہ ایک مستقل ضابطہ جاتہ اور معیاری قانون ثابت ہوتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ بائبل تو باوجود ناتمامی

قانون معیار اخلاق کی دائمی ثابت ہو اور قرآن باین جامعیت و کمال بھی معیار اخلاق کا دائمی ثابت نہ ہو حیرت ہے کہ آپ بجائے اس کے کہ انجیل سے زیادہ قرآن کے قائل ہو جاتے آپ نے اٹھا کر سرے سے بیان اخلاق ہی کی اس سے نفی کر دی جو دیانت کی بہت ہی انوکھی مثال ہے۔

بالخصوص جبکہ قرآن نے ان احکام کی صرف سیاسی حیثیت اور قانونی گہرائی ہی پیش کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ ان کی اخلاقی حیثیت پر بھی روشنی ڈالی اور ساتھ ساتھ ادھر بھی رہنمائی کی کہ یہ دس امور جس طرح قانونی حیثیت سے ممنوع ہیں اسیطرح اخلاقی حیثیت سے بھی ممنوع ہیں۔ کیونکہ اس نے ان دس باتوں کو ممانعت کے نیچے لاکر آخر میں یہ بھی کہا کہ یہ باتیں پروردگار عالم کو ناپسند ہیں اور پروردگار بوجہ شان ربوبیت اور بوجہ پالن ہار ہونے کے اپنی مخلوق کا محبوب بھی ہے اور سب جانتے ہیں کہ محبوب کی ناپسند کردہ باتوں کو محب اور عاشق کبھی گوارہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہ باتیں اصولِ محبت کی رو سے بھی ممنوع نکلیں جو ان کی اخلاقی حیثیت ہے۔ پس قرآن نے اِن باتوں کی قانونی حیثیت کے ساتھ اخلاقی حیثیت کو ہی نظر انداز نہیں کیا جبکہ انجیل نے انہیں معیاری قانون کی بھی حیثیت نہیں دی۔ چہ جائیکہ ان کی اخلاقی نوعیت نمایاں کرتی تو کیا پھر یہ نہایت ہی انوکھی منطق نہیں ہے کہ آپ جیسے سنجیدہ اور انصاف پسند انسان کے قلم پر انجیل تو معیار اخلاق کی ضامن ٹھہرے اور قرآن کے بارے میں بہت آسانی سے یہ دعویٰ کر دیا جائے کہ اس نے اخلاق کا کوئی معیار ہی قائم نہیں کیا۔ کہنے والا اگر

اسے تعصّب نہ کہیے تو اور کیا کہیے کہ وہی باتیں اگر بائبل بیان کرے اور وہ بھی ناتمام انداز سے تو انہیں معیار اخلاق پکارا جائے اور وہی چیزیں اگر قرآن بیان کرے اور ان کے اعلیٰ ترین قانونی واخلاقی پہلوؤں کو خوب خوب نمایاں کرے تو اسے سرے سے اخلاق کے بیان ہی سے قاصر وعاری اور کورا پکار دیا جائے؟

حالانکہ معیاریت کی اگر نفی ہوسکتی تھی تو انجیل سے کہ اس نے بجز حکم بیان کر دینے کے نہ معیار حکم بتلایا نہ علت حکم پر روشنی ڈالی نہ اس کے اخلاقی معیار کو نمایاں کیا جس سے بائبل کے یہ دس احکام معیار اخلاق تو کیا ثابت ہوتے معیار قانون بھی نہ ثابت ہوئے اور معیار قانون بھی کیا ثابت ہوتے معیار احکام بھی ثابت نہ ہوئے کہ یہ دس حکم ہی معیاری بن جاتے لیکن یہ نفی اگر نہ ہونی چاہیے تھی تو قرآن سے کہ اس نے اخلاق کا کامل ترین نظام قائم کر کے اصولی اخلاق اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں سے کس حد تک انسان کو روشناس کرایا مگر آپ نے نفی کی جگہ اثبات اور اثبات کی جگہ نفی رکھ کر معاملہ الٹ کر دیا جس کی ایک سنجیدہ اور باخبر انسان سے توقع نہ ہونی چاہیے تھی۔

جنوں کا نام خرد اور خرد کا نام جنوں ۔۔۔ جو چاہے آپکا حُسن کرشمہ ساز کرے

اگر آپ پورے قرآن میں سے صرف سورہ بنی اسرائیل کے یہ دو رکوع (تیسرا اور چوتھا) ہی پڑھ لیتے تو آپ کو اندازہ ہو جاتا کہ اس نے انسان کی ذاتی زندگی پھر گھریلو زندگی پھر قبائلی زندگی اور پھر قومی اور

اور جماعتی زندگی کو کسی حد تک اخلاق فاضلہ کی گرفت میں لیا اور حد و عدل والنصاف میں گھیر کر جامع اور معتدل کر دیا ہے کہ اس سے زائد ممکن نہیں۔

لیکن اب میں اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ عرض کروں گا کہ یہ دس احکام خواہ بائبل بیان کرے یا قرآن حکیم انسان کی ساری اخلاقی قدروں کا بیان نہیں جبکہ اخلاقی زندگی کے موڑ دس سے کہیں زیادہ ہیں اور دس سے کہیں زیادہ احکام کے متقاضی ہیں بائبل معیار اخلاق کے سلسلہ میں اُن دس پر قناعت کرے تو کرے کہ اسے اخلاق کا نہ کوئی قانون یا اخلاقی معیار قائم کرنا ہے اور نہ ہی انسان کو تمام رذائل اخلاق سے بچا کر سارے ہی فضائل اخلاق کی فضا میں لانا ہے لیکن قرآن حکیم ان دس باتوں پر قناعت نہیں کر سکتا تھا جبکہ اسے انسان کی پوری زندگی کی اخلاقی تکمیل کرنی تھی اور وہ دنیا میں آیا ہی تھا تکمیل اخلاق کے لئے کہ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔

چنانچہ اس نے دس کے بجائے ستر سے بھی اوپر اخلاقی اور ایمانی شعبے شمار کرائے ہیں اس لئے قرآن کے بیان کردہ یہ دس احکام جن کی طرف میں نے دو رکوعوں کا حوالہ دیا ہے درحقیقت منجملہ ستر کے ہیں چنانچہ جو قرآن کی مختلف آیتوں میں حسبِ مناسبت مقام پھیلے ہوئے ہیں چنانچہ قرآن سے محض کبائر شمار کرانے کے لئے ضخیم ضخیم کتابیں تصنیف کی گئیں جو طبع شدہ موجود ہیں جن میں ایک ایک کبیرہ کا ذکر کر کے قرآن کی آیتیں اس پر پیش کر دی گئی ہیں تطویل کا خوف نہ ہوتا تو میں یہ ستر باتیں قرآن

کی سترآیتوں سے پیش کر دیتا۔

پھران ستر سے اوپر شعبوں میں کچھ چھوٹے ہی چھوٹے گناہ شمار کرا دئے گئے بلکہ باریک سے باریک اور دقیق سے دقیق قلبی کھوٹ پر مطلع کر کے اس کا بھی علاج بتایا گیا ہے تاکہ انسانی معاشرہ کا قافلہ اخلاق کی اعلیٰ قدروں کی منزل تک پہونچ سکے چنانچہ اسلامی اصول پر معاشرہ میں کسی کی جان مال آبرو تلف کر دینا ہی گناہ نہیں کہ "تو خون مت کر" چوری مت کر" زنا مت کر" معاشرہ کی تکمیل سمجھ لی جائے بلکہ اصلاح معاشرہ کا بلند معیار بنایا گیا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے لئے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں اذیت و کوفت کا بھی سبب نہ بنے حتیٰ کہ راستہ میں اگر کوئی ایذادہ چیز جیسے کانٹا یا کیچ کا ٹکڑا یا اینٹ پتھر بھی پڑا ہوا دیکھ لیا جائے جس کے چبھ جانے یا اس سے ٹھوکر کھا جانے کا آنے جانے والوں کے لئے اندیشہ ہو تو اسے بھی اٹھا کر پھینک دینا ایک مسلم کے ایمان کا جزء قرار دیا گیا ہے۔

پس اخلاق کی بلند معیاری کے سلسلہ میں خون کر کے جان لے لینا یا چوری کر کے مال جھپٹ لینا یا زنا کر کے آبرو ریزی کر دینا تو بڑی بات ہے انسان کی معمولی سے معمولی راحت د آسائش اور یکسوئی میں خلل اندازی کا سبب بن جانا بھی گناہ اور ایمان کے خلاف قرار دیا گیا ہے تاکہ انسان دقیق سے دقیق اخلاقی مقامات پر پہونچکر ایک کامل و مکمل انسان کہلایا جا سکے۔ چنانچہ حدیث نبوی نے قرآن حکیم کی روشنی میں

معیار اخلاق قائم کرتے ہوئے ان ستر سے اوپر اخلاقی شعبوں کا اعلان کیا جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ

الایمان بضع و سبعون شعبة فافضلها قول لا اِلٰہ الا اللّٰہ و ادناها اماطة الاذی عن الطریق الحیاء شعبة من الایمان۔	ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں انیں کی افضل ترین شاخ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار ہے اور نچلی درجہ کی شاخ راستے سے ایذادہ چیز کا ہٹا دینا ہے اور حیا ایمان کا عظیم ترین شعبہ ہے (کہ اسکے بغیر کسی بھی نیک عمل کی آدمی کو توفیق نہیں ہو سکتی)
(مشکوٰۃ المصابیح)	

ان ستر سے اوپر ایمانی حصول یا اصلاحی احکام کا ماخذ قرآن حکیم ہے جن میں سے ہر حکم پر علماء نے قرآن حکیم کی وہ آیات پیش کی ہیں جن سے یہ حکم برآمد ہوتا ہے۔ پس قرآن کے نزدیک اسلامی اخلاق یا اس کے تہذیبی احکام کی بلند معیاری کا اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب اس کے نزدیک کسی کے لئے معمولی سی چبھن کا ذریعہ بن جانا یا معمولی سی چبھن زائل کرنے کا ذریعہ نہ بننا بھی معیار اخلاق بلکہ ایمان کے خلاف ہے تو جان مال آبرو تلف کرنے کے موٹے موٹے گناہوں سے بچ جانا اخلاق کا اونچا معیار کب بن سکتا ہے؟

جس کی وجہ یہ ہے کہ بلندئ کردار موٹے موٹے گناہوں سے بچ جانے میں نہیں دیکھی جاتی جو آپ نے بائبل سے دکھلائی ہے بلکہ حقیر حقیر برائیوں سے بچنے میں دیکھی جاتی ہے جس کو ابھی قرآن سے پیش کیا گیا ہ

پس کسی اچھے سیاری انسان کی تعریف یہ نہیں ہو سکتی کہ وہ زناکار نہیں چور نہیں خونی نہیں یہ تعریف نہیں بلکہ مذمت ہے تعریف اگر ہو سکتی ہے تو یہ کہ فلاں انسان ان بڑی برائیوں میں تو کیا مبتلا ہوتا وہ تو دوسروں کی ایذا رسانی کے تصور سے دور بھاگتا اور بچتا ہے اور حقیر سے حقیر معصیت سے بھی کنارہ کش رہتا ہے۔

سو اس حدیث نے انسانی کردار کی بلندی کا بھی معیار قائم کیا ہے کہ وہ کسی کے حق میں بڑی اذیت تو درکنار جس سے جان مال آبرو پر بن جائے ذرا سی اذیت سبب بن جانا بھی گوارہ نہ کرے اور اسے ایمان کے خلاف سمجھے۔

اندریں صورت اگر اس پر حیرت کا اظہار نہ کیا جائے تو اور کیا کیا جائے۔ بائبل کی دس باتیں اور وہ بھی موٹی موٹی برائیاں جو انبیاء کے نہیں فلسفیوں کے نزدیک بھی بری ہیں، آپ نے بر خود انہیں تو معیار اخلاق فرما دیا درحالیکہ وہ نا بلندی کردار و افعال کا بھی معیار نہیں بن سکتیں چہ جائیکہ بلند اخلاقی کا معیار ہوں لیکن قرآن و حدیث کی ستر سے اوپر معیاری باتیں سامنے ہوتے ہوئے بھی جن سے حقیقتاً کردار و اخلاق کی بلندی کا معیار قائم ہوتا ہے آپ نے سرے سے اسلام سے اخلاق و معیار اخلاق ہی کی کلی کی نفی فرما دی۔ اسے تعصب کہا جائے یا لاعلمی اور سادہ لوحی کی بے خبری۔؟

اگر آپ کے نزدیک بائبل دس موٹی اور مسلمہ افق باتیں بتلا کر

معیار اخلاق کی کفیل ہو سکتی ہے تو قرآن ستر سے اوپر تہذیبی افعال کی تعلیم دے کر معیار اخلاق کا ضامن کیوں نہیں ہو سکتا

پھر قرآن نے اِن ستر باتوں ہی کے بیان کر دینے پر قناعت نہیں کی کہ صرف انہی سے اخلاقی معیار کی بلندی سمجھ لی جائے بلکہ اس نے بتلایا کہ زندگی میں اس کے سوا اور بھی بہت سے گوشے ہیں جن میں بلندی اِخلاق و کردار کی از بس ضرورت ہے اور وہ یہ کہ ہر عبادت ہر سیاست ہر معاشرہ اور ہر قانون میں بھی بلندی کردار و اخلاق ناگزیر ہے۔ جس کے بغیر زندگی اسلامی نہیں بن سکتی چنانچہ قرآن نے ہر عباداتی ہر سیاستی ہر قانونی اور معاشرتی حکم کے آخر میں اس حکم کا کوئی نہ کوئی اخلاقی پہلو ضرور ذکر کیا ہے جس سے معاشرت روزمرّہ کی زندگی میں بھی بندہ کا خدا سے رابطہ قائم رہے جو سرچشمۂ اِخلاق و کمالات ہے اور واضح ہو جائے کہ ایک انسان خدائی اخلاق کی بلندی پر صرف رسمی اور قانونی اندازی سے نہ پہونچے بلکہ وہاں بھی اخلاقی ہی قدروں کے ساتھ بڑھے تاکہ عبد معبود میں محبت اور محبت سے اخلاقی روشنی کی درآمد اوپر سے ہوتی رہے چنانچہ ہر قانونی حکم کے آخر میں یا اتقوا اللہ (خدا سے ڈرو) یا قیامت یا موت یا حق تعالیٰ کے سامنے حاضری یا محاسبہ یا مؤاخذۂ آخری وغیرہ کے عنوانات ضرور ہوتے ہیں جن سے حکم کا اخلاقی پہلو ہی آخر کار غالب رہتا ہے جس سے پورا کا پورا قرآن اول سے آخر تک اخلاقی قدروں ہی سے بھرپور نظر پڑتا ہے بشرطیکہ نظر ہو اور اسے کام میں لایا جائے۔ مگر دعویٰ

پھر بھی کہا گیا ہے کہ قرآن نے کوئی اخلاقی معیار پیش ہی نہیں کیا ؟

اتنی تفصیل کے بعد اب میں معیارِ اخلاق کے سلسلہ میں کچھ عرض کرونگا جسے آپ نے انجیل کی خصوصیت قرار دیا ہے درحالیکہ انجیل میں آپ کی تصریحات کی روشنی میں معیارِ اخلاق تو کیا ہوتا معیارِ قانون اور معیارِ احکام بھی مذکور نہیں معیارِ اخلاق کے عنوان کے تحت آپ اس پر غور فرماویں کہ بیانِ احکام کی یہ نوعیت کہ انجیل دس احکام سے آگے نہیں بڑھی اور قرآن ستر سے بھی اوپر نکل گیا۔ پھر اس نے ان احکام کے ساتھ معیارِ قانون بھی پیش کیا جس سے احکام معیاری ہو گئے اور اوپر سے ہر قانونی حکم میں بھی اخلاقی قدروں کی طرف توجہ دلائی جس سے قرآن کا قانون دیانت بھی اخلاقی رنگ سے رنگا گیا مگر اس پر بھی اسلام نے اپنے بلند ترین نقطۂ نظر سے اسے معیارِ اخلاق نہیں کہا۔ معیارِ اخلاق اس سے کہیں زیادہ بلند چیز ہے جسے صرف اسلام ہی نے پیش کیا ہے جب کہ دوسری ملتیں اس میں ساکت محض ہو کر رہ گئی ہیں یا ناطق ہوئیں تو ناتمام انداز سے اس کی تفصیل یہ ہے کہ اسلامی اصول پر معیارِ اخلاق یہ دس یا ستر افعال نہیں بن سکتے کیوں کہ جیسا میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ افعال خود اصل نہیں بلکہ اخلاق کے فروعی آثار ہیں اور اخلاق سے اسیطرح سرزد ہوتے ہیں جیسے تخم میں سے شاخیں پھوٹتی ہیں اس لئے اخلاق اصل ہیں اور افعال ان کی فرع۔ اور ظاہر ہے کہ فرع اپنی اصل کے اچھے برے ہونیکی علامت تو ہو سکتی ہے معیار نہیں بن سکتی کہ اس کی وجہ سے اصل

بھلی یا بری بن جایا کرے کیوں کہ فرع اصل میں سے نکلتی ہے۔ اصل فرع میں سے نہیں پھوٹتی اس لئے فرع کی برائی بھلائی اصل میں سے آئے گی اور اس لئے اصل بھی فرع کے برے بھلے ہونیکا معیار بنے گی نہ کہ قصہ برعکس ہوگا۔ اس لئے انجیل والی دس باتیں ہوں یا اسلام والی ستر باتیں یہ سب کے سب افعال ہیں جو کسی نہ کسی قلبی خلق سے سرزد شدہ ہیں اسلئے وہ اپنی اصل یعنی اخلاق کے لئے معیار نہیں ہو سکتے بلکہ یہ اخلاق ہی ان ظاہری افعال کے لئے معیار ہوں گے کہ وہ اصل ہیں رہا یہ کہ خود ان اخلاق کے اچھے برے ہونیکا کیا معیار ہے جب کہ یہ افعال ان کا معیار نہیں۔

سو ظاہر ہے کہ اس اصول پر کہ ہر چیز کا معیار اس کی اصل اور باطنی جڑ ہوتی ہے اخلاق کا معیار بھی ان اخلاق کی جڑیں ہی ہو سکتی ہیں کہ انھیں کے معیار سے یہ انسانی اخلاق اچھے برے کہے جا سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ مخفی جڑیں اور اصلیں جن سے انسان کے پاکیزہ اخلاق کا درخت اگتا ہے افعال انسانی نہیں بلکہ اخلاقِ خداوندی ہو سکتے ہیں پس جیسے انسانی عمل کا معیار انسانی اخلاق ہیں جو اس کے عمل کی جڑیں ہیں ایسے ہی انسانی اخلاق کا معیار اخلاق خداوندی ہیں جو انسانی اخلاق کی جڑیں ہیں پس انسان کا جو خلق کسی خلق ربانی سے جڑا ہوا ہوگا۔ وہی خلق حسن کہلائے گا اور جو خلق کسی خلق الٰہی سے کٹا ہوا ہوگا یا اس کے منافی ہو وہی بد خلقی قرار پائے گا۔ اس لئے ہمارے اخلاق

کا معیار درحقیقت خدائے برتر کے اخلاق قرار پاتے ہیں نہ کہ خود ہمارے افعال خواہ وہ خون سے بچنے کے نہ ہوں یا چوری وزنا سے اجتناب کرنے کے ہوں اس لئے جب معیارِ اخلاق کی بحث آئیگی تو اخلاق خداوندی کی طرف رجوع کیا جائے گا نہ کہ ہمارے افعال کی طرف، سو وہی خداوندی اخلاق جو معیارِ اخلاق ہیں اصولاً عدد میں ننانوے ہیں جن کا دعویٰ میں نے اپنے سابقہ عریضہ میں کیا تھا اور جب وہی ہمارے اخلاق کے حسن و قبیح کا معیار ہیں اور انہی سے ہمارے اخلاق اخلاقِ حسنہ بنتے ہیں تو انسان کے حق میں بھی اخلاق حسنہ کے اصول ننانوے ہی ثابت ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہ ننانوے اصول ذاتِ بابرکات کے حق میں اصلی اور ذاتی ہیں اور ہمارے حق میں عارضی اور ظلی ہیں جو ہمارے رجوع اور اس کے فیضان سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

پس جس حد تک اس رجوع کے ذریعہ انسان کو ذاتِ حق سے قرب ہوگا اسی حد تک اخلاقی کمالات کا دھارا اسکی طرف بہ نکلیگا۔ اور جس حد تک آدمی اپنی شہوات و خواہشات میں پڑ کر خدا سے دور رہے گا اسی حد تک اخلاق فاضلہ سے محروم رہ جائے گا حاصل یہ ہے کہ اخلاق فاضلہ اصولاً ننانوے ہیں جن کے بغیر آدمی نہ بااخلاق بن سکتا ہے اور نہ اس کا معیارِ اخلاق ہی قائم ہو سکتا ہے۔

آپ نے اپنے والا نامہ میں میرے ان دعویٰ کردہ ننانوے اخلاق کا ثبوت قرآن سے مانگا ہے تو گو میں تمہید میں عرض کر چکا ہوں کہ

آپ کو دلیل خاص کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں آپ مطلق دلیل مانگ سکتے ہیں خواہ میں اسلام کی شرعی حجتوں کتاب وسنت اور اجماع وقیاس میں سے کسی دلیل سے بھی ثبوت پیش کردوں آپ کو بطور ثبوت اُسی کو ماننا پڑے گا لیکن میں محض آپ کی خاطر سے ان ننانوے اخلاق خداوندی کا اور آپ کے الفاظ میں "معیارِ اخلاق" کا جو خدا ہی کے اخلاق ہو سکتے ہیں قرآن ہی سے ثبوت پیش کیے دیتا ہوں۔

حق تعالیٰ کے یہ صفاتی نام یا اخلاقی اسمار یوں تو قرآن کریم میں ننانوے سے بھی زیادہ آئے ہیں اور بعض روایات سے ان کے علاوہ ایک ہزار تک بھی ثابت ہو گئے ہیں جیسا کہ امام نووی نے شرح مسلم میں بیان فرمایا ہے لیکن ان میں اصول اخلاق ننانوے ہی ہیں اس لئے حدیث ترمذی میں بنام اسمار الہیہ انہی ننانوے کا ذکر فرمایا گیا جس کا ماخذ قرآن حکیم ہے سو اولاً ان اسمار کو آپ حدیث ترمذی میں ملاحظہ فرمایئے اور پھر اسی ترتیب سے قرآن حکیم میں دیکھئے۔

ترمذی شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ۔

ان اللہ تعالیٰ تسعۃ وتسعین اسماً من احصاھا دخل الجنۃ ھو اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم الملک القدوس السلام المؤمن المھیمن العزیز الجبار المتکبر الخالق الباری

المصور الغفار القہار الوہاب الرزاق الفتاح
العلیم القابض الباسط الخافض الرافع المعز
المذل السمیع البصیر الحکم العدل اللطیف
الخبیر الحلیم العظیم الغفور الشکور العلیّ
الکبیر الحفیظ المقیت الحسیب الجلیل
الکریم الرقیب المجیب الواسع الحکیم۔
الودود المجید الباعث الشہید الحق الوکیل
القویّ المتین الولی الحمید المحصی
المبدئ المعید المحیی الممیت الحی القیوم
الواجد الماجد الواحد الاحد الصمد القادر
المقتدر۔ المقدم المؤخر الاول الآخر الظاہر
الباطن الوالی المتعالی البر التواب المنتقم
العفوّ الرؤف مالک الملک ذوالجلال۔
والاکرام المقسط الجامع الغنیّ المغنی
المانع الضارّ النافع النور الہادی
البدیع الباقی۔ الوارث الرشید الصبور

(رواہ الترمذی)

اب ان ننانوے اسمائے اخلاق کو اسی ترتیب سے جس سے وہ حدیث مذکور میں وارد ہوئے ہیں قرآن حکیم میں ملاحظہ فرمائیے

جہاں سے اللہ کے رسول نے لیکر انہیں اپنے کلام پاک (حدیث) میں پیش فرمایا آپ نے مجھ سے مطالبہ کیا تھا کہ میں دو چار اخلاق ہی بطور مثال کے قرآن سے پیش کر دوں مگر میں ننانوے کے ننانوے بلکہ پورے سو اسمار قرآن ہی سے پیش کر رہا ہوں قرآن نے اسمار اخلاق وصفات کا آغاز کرتے ہوئے بعض اسمار تو بصورت اسمار ہی ذکر کئے ہیں جن کو حدیث نبوی نے بعینہ اسی طرح لے لیا ہے جس طرح وہ قرآن حکیم میں نازل ہوئے اور بعض کو بصورت افعال ذکر کیا ہے حدیث نے اس فعل سے اس کا اسم لے لیا ہے اور بعض اسمار کو اشتراک معنی کی وجہ سے بصورت مادہ ذکر کیا ہے۔ جس سے حدیث نے اسم بنا کر بصورت اسم انہیں پیش کیا ہے بعض جگہ قرآن نے کسی اسم کی ضد کی نفی کر کے اصل اسم کی نشاندہی کی ہے اور حدیث نے اس نشاندہی سے اصل اسم ذکر کیا ہے اور کہیں قرآن نے دو اسموں کے ہم معنی ہونیکی وجہ سے ایک اسم ذکر کیا ہے جس سے دوسرے ہم معنی اسم کی طرف اشارہ نکلتا ہوا دیکھکر حدیث نے وہ اشارہ کردہ اسم لے لیا ہے اس قسم کے چند اسمار جو قرآن میں اسم کی صورت سے مذکور نہیں بلکہ فعل یا مادہ یا باقتضا تقابل یا بصورت اشتراک معنی مذکور ہوئے ہیں ان ننانوے میں سے تیس (۳۰) ہیں بقیہ انہتر (۶۹) نام اسی اسمی صورت سے قرآن میں بھی مذکور ہیں جس صورت سے وہ حدیث نبوی میں منقول ہوئے ہیں۔

پس ایسے مواقع پر جہاں قرآن نے یہ تیس (۳۰) اسمار فعلی یا صوری یا مادی یا تقابلی یا اشتراک معنوی کی صورت سے ذکر کیے ہیں ہم نے وہاں حدیث کا اسم ذکر کر کے اس کے قرآنی کلمہ سے ماخوذ ہونے کی کیفیت پر بھی روشنی ڈالدی ہے تاکہ یہ نمایاں ہو سکے کہ حدیث کا ذکر کردہ اسم قرآن سے کیسے نکلا ہے؟

اب حدیث ترمذی کی ترتیب کے مطابق یہ ننانوے اخلاق خداوندی یا ننانوے اسمار اخلاق قرآن حکیم میں ملاحظہ ہوں جس پر مکررات چھوڑ کر شمارہ لگا دیا گیا ہے اور سورتوں کے حوالے دیدیے گئے گئے ہیں نیز آیت کا ترجمہ بھی نقل کر دیا گیا ہے جس میں اس اسم صفاتی کا ترجمہ بھی آگیا ہے۔ اولاً اس بارہ میں قرآن کی تمہید ملاحظہ ہو جس میں اس نے ان اخلاق الہیہ کا لقب ذکر فرمایا کہ وہ اسمار حسنیٰ ہے اور پھر اُن میں فرق مراتب کا دکھلاتے ہوئے بعض صفاتی اسمار کو ذاتی اسم کے ہم پلہ قرار دیا ہے اور اس کے بعد پھر ان اخلاقی اسمار کو مختلف آیات میں شمار کرا دیا اولاً قرآن حکیم کی وہ آیت ملاحظہ فرمایئے جس میں اس نے اِن اخلاقی اور صفاتی ناموں کا لقب "اسمار حسنیٰ" تجویز کیا اور ان سے استفادہ کرنے کی صورت پر روشنی ڈالی ہے ارشاد خداوندی ہے۔

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی	اور اللہ کے لئے ہیں اچھے نام سو
فَادْعُوْہُ بِھَا وَذَرُوا الَّذِیْنَ	انہیں ناموں سے اُسے پکارو۔

یُلحدونَ فی اسماءہ سیجزون ماکانوا یعلمون۔ (الانعام)

اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں کے بارے میں ٹیڑھی راہ چلتے ہیں (یعنی اپنے ناقص علم سے خود ہی اس کے نام تجویز کرکے اسے پکارتے ہیں جس سے اسکی حقیقی عظمت وشان کا حق ادا نہیں ہوتا اور اس طرح وہ اسکی شان میں بے ادبی کے مرتکب ہوتے ہیں) سو وہ بدلہ پائیں گے اپنے کیے کا۔

پھر ایک جگہ قرآن نے اس لقب (اسمارحسنیٰ) کا ذکر کرکے اسکے نیچے بعض وہ نام بھی ذکر کیے جو حدیث ترمذی میں بیان کیے گئے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ اسمارحسنیٰ کا مصداق اس کے نزدیک بھی اللہ کے وہی صفاتی نام ہیں جو اللہ کے رسول نے اپنی حدیث میں بیان فرمائے ہیں مثلاً ایک جگہ اسمارحسنیٰ کے عنوان کے نیچے اللہ کا سب سے بڑا وہ صفاتی نام ذکر کیا جو ذاتی نام کے ہم پلّہ تھا تاکہ اس صفتی نام کا دوسرے صفاتی ناموں پر امتیاز اور تفوّق نمایاں ہو جائے کیوں کہ وہی صفت اسکی دوسری صفات پر غالب اور سابق ہے ارشادِ حق ہے۔

قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن ایا ما تدعوا فلہ الاسماء الحسنیٰ۔ (بنی اسرائیل)

کہہ دو (اے رسول) تم اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جون سے نام سے بھی پکارو سو اسی کے ہیں سب نام اچھے۔

. . . .

پھر ایک موقع پر قرآن نے اسی اسمارحسنیٰ کے عنوان کے ساتھ ایک سے

زائد صفاتی نام سورہ حشر کے آخری رکوع میں ذکر فرمائے اور ان پر اسمار حسنیٰ ہونے کی مہر لگادی تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ اسمار حسنیٰ اللہ کے وہی صفاتی نام ہیں جن کا ذکر حدیث نبوی نے کرکے ان کا عدد ننانوے متعین فرمایا اور خوب کھل کر سامنے آجائے کہ حدیث نبوی کے بیان کردہ اسمار صفات یہی ہیں جنہیں قرآن نے اسمار حسنیٰ کی لقب کے ساتھ ذکر فرمایا ہے بہرحال قرآن نے اپنے حکیمانہ طرز بیان سے اللہ کے یہ اخلاق اور اخلاقی اسمار حسب ذیل انداز سے پیش فرمائے ہیں جن کو حدیث ترمذی کی ترتیب کے موافق ہم آیات قرآن سے نقل کرتے ہیں ارشاد ربانی ہے۔

هو الله الذی لا اله الا هو	وہ اللہ ہے جس کے سوا بندگی نہیں کسی کی
عالم الغیب والشهادة۔	جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا
هو الرحمن (۱) الرحیم (۲)	وہ ہے بڑا مہربان (۱) رحم والا (۲)
هو الله الذی لا اله	وہ اللہ ہے جس کے سوا بندگی نہیں
الا هو الملک (۳) القدوس (۴)	کسی کی وہ بادشاہ (۳) ہے پاک ذات (۴)
السلام (۵) المؤمن (۶) المهیمن (۷)	سب عیبوں سے سالم (۵) امان دینے والا (۶)
العزیز (۸) الجبار (۹) المتکبر (۱۰)	پناہ میں لینے والا (۷) زبردست (۸) دباؤ والا (۹)
سبحان الله عما یشرکون	بڑائی والا (۱۰) پاک ہے اللہ انکے شریک بتلانے سے
هو الله الخالق (۱۱) البارئ (۱۲)	وہ اللہ ہے بنانیوالا (۱۱) نکال کھڑا کرنیوالا (۱۲)
المصور (۱۳) له الاسماء الحسنیٰ (الحشر)	صورت کھینچنے والا (۱۳) اسی کے ہیں سب نام اچھے

الا ھو العزیز[۱۴] الغفار (الزمر)

سنتے ہو؟ وہی ہے زبردست گناہ بخشنے والا[۱۴]

ھو اللہ الواحد القہار[۱۵] (الزمر)

وہی ہے اکیلا دباؤ والا[۱۵]۔

العزیز الوھاب[۱۶] (ص)

زبردست ہے بہت بخشنے والا[۱۶]۔

ان اللہ ھو الرزاق[۱۷] ذو القوۃ المتین (الذاریات)

بلاشبہ اللہ وہی ہے روزی دینے والا[۱۷] زور آور۔ مضبوط۔

وھو الفتاح[۱۸] العلیم[۱۹] (السبا)

اور وہی ہے معاملہ چکانے والا[۱۸] سب کچھ جاننے والا

واللہ یقبض ویبسط والیہ ترجعون[۲۰] اسمیں القابض اور الباسط مذکور ہیں یعنی تنگی دہندہ اور کشائش کنندہ۔

اور اللہ ہی تنگی کر دیتا ہے[۲۰] اور وہی کشائش کرتا ہے[۲۱] اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤگے۔

. . . .

والارض وضعھا للانام (الرحمٰن)

اور زمین کو نیچا کیا (بچھا دیا) اس نے خلقت کیلئے۔

اسمیں معنیٰ الخافض[۲۲] مذکور ہے کیونکہ وضع اور خفض کے ایک ہی معنی ہیں جو رفع کے مقابلہ میں آتا ہے یعنی نیچا کرنا۔

(یعنی وہ نیچا کرنے والا ہے[۲۲])

. .

. . . .

والسماء رفعھا۔

اور آسمان کو اونچا کیا اس نے

اسمیں الرافع[۲۳] مذکور ہے

یعنی اونچا کرنے والا[۲۳]۔

وتعز من تشاء وتذل من تشاء (آل عمران)

تو عزت دے جسے چاہے اور ذلیل کرے جسے چاہے۔

اسمیں المعز[۲۴] اور المذل[۲۵] مذکور ہے	یعنی وہی عزت دہندہ[۲۴] اور ذلیل کنندہ ہے
لیس کمثلہ شیٔ[۲۶] وھو السمیع	کوئی چیز اس جیسی نہیں اور وہی ہے
البصیر[۲۷] (الشوریٰ)	سننے والا[۲۶] دیکھنے والا[۲۷]
افغیر اللہ ابتغی حکما[۲۸]	سو کیا اب اللہ کے سوا کسی اور کو
(الانعام)	منصف[۲۸] بناؤں ؟
ان اللہ لا یظلم مثقال	بے شک اللہ ذرہ برابر ظلم نہ کریگا
ذرۃ (النساء)	. . . . . .
[۲۹] ظلم کی کلی نفی سے اسم العدل	یعنی عدل[۲۹] کل ہے
نکلتا ہے کیونکہ جو ذرہ برابر ظلم	. . . . . .
نہ کرے وہی ازل اول تا آخر عدل کل	. . . . . .
ہوگا ۔	. . . . . .
وھو اللطیف[۳۰] الخبیر[۳۱] (الملک)	وہی ہے بھید جاننے والا[۳۰] - خبردار[۳۱]
واللہ شکور علیم[۳۲]	اور اللہ ہے قدر والا بڑا باوقار[۳۲]
وھو العلی[۳۳] العظیم (البقرہ)	اور وہی ہے سب سے برتر[۳۳] عظمت والا
وھو الغفور[۳۴] الودود	اور وہی ہے بخشنے والا[۳۴] محبت
ذو العرش المجید (البروج)	کرنے والا عرش والا ۔
واللہ شکور حلیم[۳۵]	اور اللہ ہے قدر والا[۳۵] بڑا باوقار
وان اللہ ھو العلی[۳۶]	اور اللہ وہی ہے سب سے اوپر[۳۶]
الکبیر[۳۷] (لقمان)	بڑا[۳۷] ۔

فاللہ خیرٌ حافظا (یوسف)	سو اللہ ہے بہتر نگہبان
اس کا اسم الحفیظ ۳۸ نکلتا ہے جو حافظ کا ہم معنی ہے	یعنی بہت بڑا نگہبان ۳۸
وکان اللہ علی کل شئ مقیتا ۳۹	اور اللہ ہے ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ۳۹
وکفی باللہ حسیبا ۴۰ (النساء)	اور بس ہے اللہ کفایت کرنیوالا ۴۰
تبارک اسم ربک ذی	بڑی برکت ہے نام کو تیرے رب کے
الجلال والاکرام (الرحمن)	جو بڑائی والا ہے
ذی الجلال میں اسم الجلیل ۴۱ مذکور ہے	یعنی بزرگی والا ۴۱
اور ذی الاکرام میں اسم الکریم ۴۲ مذکور ہے	یعنی بزرگی والا ۴۲
وکان اللہ علی کل شئ رقیبا ۴۳ (الاحزاب)	اور اللہ ہے ہر چیز پر نگہبان ۴۳
اُجیب دعوۃ الداع اذا	قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والیکی دعا
دعان (البقرہ)	کو جب وہ مجھسے دعا مانگے۔
اسمیں المجیب ۴۴ مذکور ہے	یعنی قبول کنندہ دعا ۴۴
وکان اللہ واسعاً ۴۵ حکیما ۴۶ (النساء)	اور اللہ کشائش والا ۴۵ تدبیر والا ۴۶
وھو الغفور الودود ۴۷ (البروج)	اور وہی بخشنے والا محبت کرنے والا ۴۷
انہ حمید مجید ۴۸ (الھود)	تحقیق اللہ ہی تعریف کیا گیا بڑائیوں والا ۴۸
وان اللہ یبعث من	اور یہ کہ اللہ اٹھائے گا قبروں میں
فی القبور (الحج)	پڑے ہوؤں کو۔
اسمیں الباعث ۴۹ مذکور ہے	یعنی اٹھانے والا ۴۹ ۔
وھو علی کل شئ شھید (السبا)	اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

ذلک بان اللہ ھو الحق [۵۱] (لقمٰن)	یہ اس لئے کہ اللہ وہی ہے ٹھیک [۵۱] (اور اصل ثابت)
وھو علیٰ کل شئ وکیل [۵۲] (الزمر)	اور وہی ہے ہر چیز کا ذمہ دار [۵۲]
وھو القوی العزیز [۵۳] (الشوریٰ)	اور وہی ہے زور آور زبردست [۵۳]
ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین [۵۴] (الذاریات)	بلاشبہ اللہ وہی ہے روزی دینے والا زور آور مضبوط [۵۴]۔
وھو الولی [۵۵] الحمید [۵۶] (الشوریٰ)	اور وہی ہے کام بنانیوالا [۵۵] سب تعریفوں کے لائق [۵۶]
احصٰہ اللہ ونسوہ (المجادلہ)	اور اللہ نے (وہ سب اعمال) گن رکھے ہیں
اسمیں المحصی [۵۷] مذکور ہے	اور وہ بھول گئے (یعنی شمار کنندہ [۵۷])
وھو الذی یبدؤا الخلق ثم یعیدہ وھو اھون علیہ (الروم)	اور وہی ہے جو پہلی بار بناتا ہے اور پھر اس کو دہرائیگا اور یہ اسپر زیادہ آسان ہے
اسمیں اسم المبدی [۵۸] اور المعید [۵۹] مذکور ہے	یعنی ابتدا کنندہ [۵۸] اور اعادہ کنندہ [۵۹]
ھو الذی یحی ویمیت (المؤمن)	وہی ہے جو جلاتا اور مارتا ہے
اسمیں اسم المحی [۶۰] اور الممیت [۶۱] مذکور ہے	یعنی حیات دہندہ [۶۰] اور موت دہندہ [۶۱]
اللہ لا الہ الا ھو الحی [۶۲] القیوم [۶۳] (البقرہ)	اللہ ہے کسی کی نہیں بندگی اس کے سوا زندہ [۶۲] سب کا تھامنے والا [۶۳]
ووجدک ضالا فھدیٰ (الضحیٰ)	اور پایا آپ کو ناواقف پس واقف کردیا
اسمیں الواجد [۶۴] مذکور ہے	یعنی پا لینے والا [۶۴]
انہ حمید مجید (الھود)	بے شک وہ ہے سب تعریفوں کے لائق بڑی شان والا
مجید میں اسم الماجد [۶۵] مذکور ہے کیونکہ ہر مبالغہ میں اصل کا ہونا لازمی ہے	یعنی شان والا [۶۵]

لِلّٰہِ الواحد القہار (الغافر) [66]
(ملک) اکیلے خدا کا ہے جو دباؤ والا [66]

قل ہو اللہ احد اللہ الصمد (الاخلاص) [67]
تو کہو وہ اللہ ایک ہے [67] اللہ بے نیاز ہے [68]

قل ہو القادر علی ان [69]
کہہ دیجئے کہ وہ قادر ہے [69] اس پر کہ بھیجے

یبعث علیکم عذابا (الانعام)
تم پر عذاب، نزدیک بادشاہ کے

عند ملیک مقتدر [70] (القمر)
جس کا سب پر قبضہ ہے [70]

ہو الاول [71] والآخر [72] والظاہر [73]
وہی ہے سب سے پہلا [71] اور سب سے [72]

والباطن [74] (الحدید)
پچھلا اور باہر [73] اور اندر [74]

اول و آخر میں المقدم [75] اور
یعنی سب سے اول [76] اور سب

المؤخر [76] موجود ہے کیونکہ جو اول و آخر ہوگا،
سے آخر۔

وہی مقدم مؤخر بھی ہوگا۔

. . . . . .

ومالہم من دونہ من
اور نہیں ہے ان کے لئے اس کے

وال [77] (الرعد)
سوا کوئی والی [77]

عالم الغیب والشہادۃ
جاننے والا کھلے اور چھپے کا سب

الکبیر المتعال [78] (الرعد)
سے بڑا برتر [78]۔

انہ ہو البر الرحیم [79] (الطور)
بے شک وہی ہے نیک سلوک والا مہربان [79]

وان اللہ تواب [80] حکیم (النور)
اور بے شک اللہ ہی معاف کرنیوالا [80] حکمتیں جاننے والا

واللہ عزیز ذو انتقام (آل عمران)
اور اللہ ہے زبردست بدلہ لینے والا

اسمیں المنتقم [81] مذکور ہے
یعنی بدلہ لینے والا [81]

وان اللہ لعفو [82] غفور [83] (الحج)
اور بیشک اللہ ہی معاف کرنیوالا [82] بخشنے والا

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ ۸۳	بیشک اللہ لوگوں پر بہت شفیق ۸۳
رَحِیْمٌ (البقرہ)	نہایت مہربان ۔
قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ ۸۴ (آل عمران)	کہہ اے اللہ ملک کے مالک ۸۴ ۔
وَیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ ۸۵	اور سدا رہنے والی ہے ذات تیرے
وَالْاِکْرَامِ (الرحمٰن)	رب کی جو بڑائی ۸۵ والا اور بزرگی والا ہے
وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ	اور رکھیں گے ہم ترازو ہیں انصاف کی
لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا	قیامت کے دن پس کسی نفس پر کچھ بھی ظلم نہ ہوگا
اس سے المقسط ۸۶ نکلتا ہے	یعنی انصاف والا ۸۶
اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ النَّاسِ ۸۷	بیشک اللہ جمع کرنیوالا ہے لوگوں کا ۸۷
لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ (آل عمران)	ایکدن میں جس میں کوئی شک نہیں ۔
وَھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۸۸ (الفاطر)	اور وہی ہے بے پرواہ ۸۸ سب تعریفوں کے لائق
وَاِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً فَسَوْفَ	اور اگر تم ڈرتے ہو فقر و فاقہ سے
یُغْنِیْکُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ	تو عنقریب ہی غنی کر دیگا تم کو اللہ
اِنْ شَاءَ (التوبہ)	اپنے فضل سے اگر چاہے گا ۔
اسمیں اسم المغنی ۸۹ مذکور ہے	(یعنی غنی کرنے والا)
وَمَا یُمْسِکْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ	اور جو روک رکھے اور منع کر دے
مِنْ بَعْدِهٖ (الفاطر)	(رحمت کو) تو کوئی نہیں اُسے بھیجنے والا
اس سے اسم المانع ۹۰ نکلتا ہے جو روک کا ہے	یعنی روک دینے والا ۔
قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	بولے (ابراہیم) کیا پھر تم پوجتے ہو

مالا ینفعکم شیئاً
ولا یضرکم۔ (ابراھیم)

اللہ سے ڈرے ایسے کو جو نہ تمہیں نفع
دے سکے نہ ضرر (یعنی نافع اور ضار ہونا صرف
اللہ کی صفت ہے)

اسمیں سے الضار ۹۱ اور النافع ۹۲ نکلتا ہے

یعنی نفع دہندہ ۹۱ اور ضرر دہندہ ۹۲

اللہ نور السموٰت ۹۳ والارض (النور)

اللہ روشنی ہے ۹۳ آسمانوں کی اور زمین کی

وان اللہ لھادی ۹۴ الذین
آمنوا الی صراط مستقیم (الحج)

اور بلاشبہ اللہ ھدایت ۹۴ دینے والا ہے
ایمان والوں کو سیدھے راستہ کی۔

بدیع ۹۵ السموٰت والارض (الانعام)

ایجاد کرنے ۹۵ والا آسمانوں اور زمین کا

ویبقی وجہ ربک (الرحمن)

اور باقی رہیگی ذات تیرے رب کی۔

اسمیں الباقی ۹۶ مذکور ہے

(یعنی ہمیشہ رہنے والا)

وکنا نحن الوارثین (القصص)

اور ہم ہیں آخر کو سب کچھ لینے والے

اسمیں الوارث ۹۷ مذکور ہے کیونکہ ہر
جمع میں اس کا مفرد ہونا لازمی ہے۔

اصلی وارث جو سب کے بعد بھی
قائم رہینگے۔

وھیئ لنا من امرنا رشدا

اور مہیا فرمادے (اے رب)
ہمارے امور میں نیکی کی راہنمائی

اس سے الرشید ۹۸ نکلتا ہے کیونکہ جو رشد
دیگا وہ خود رشید ہونا چاہیے ورنہ رشد
اس سے کیسے مل سکیگا۔

(یعنی اچھائی کا بتانے والا)

. . . . .

واللہ غفور حلیم (التغابن)

اور اللہ ہے بہت بخشنے والا بردبار

حلیم معنی سے اسم الصبور ۹۹ نکلتا ہے جسکے معنی بردبار کے ہیں یعنی ۹۹ (بڑا بردبار)

یہی حق تعالیٰ کے وہ اصول اخلاق، رحم و کرم، حلم و صبر، عفو و درگذر، بڑائی، عظمت، قدرت، قوت محبّت، عدل، انصاف، علیمی و خبیری، وسعت و احاطہ، یکتائی، غنا، نورانیت، ہدایت۔ بزرگی، حفظ و نگہبانی، نفع و ضرر، رسائی کی طاقت، انعام و انتقام سلب و عطا، ثبات و استقلال، مصدریت کمالات، تقدّس، پاکی، حکومت و ملوکیت، لطافت و ستھرائی، عُلوِّ شان، اعزاز و تذلیل، وغیرہ ہیں جن کی اصولی تعداد ننانوے تک پہونچتی ہے جنہیں حدیث نے اسمار الٰہیہ کے نام سے تعبیر کیا اور قرآن نے اسمار حسنیٰ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یہی وہ پاکیزہ اخلاق خداوندی ہیں جنہیں حاصل کرنیکے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو امر فرمایا کہ۔

تخلقوا باخلاق اللہ۔ — اللہ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو۔

اور انہی اخلاق الٰہیہ سے مخلوق کی اخلاقی تکمیل کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے چنانچہ خود ہی حضورؐ نے ارشاد فرمایا

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ — میں بھیجا ہی گیا ہوں اس لئے کہ پاکیزہ اخلاق کو حد کمال تک پہونچادوں،

یہی اخلاق ہیں جن سے انسان سعادت اور مرتبہ خلافت پر پہنچتا ہے کیوں کہ جب منیب کے اوصاف نائب میں جڑ پکڑ لیتے ہیں جب ہی نائب منیب کا کارندہ اور اس کی طرف سے کارفرما بنتا ہے ورنہ اپنے علم و ہنر سے بیگانے کو کون اپنا خلیفہ بناتا ہے؟

اس سے اندازہ ہو گیا کہ اخلاق کا معیار ذات حق سبحانہ وتعالیٰ ہے جو اس کے اخلاق ہیں وہی پاک و برتر ہیں اس لئے جس کے اخلاق ان اخلاق پر منطبق ہو گئے وہی بدرجہ انطباق کامل ومقبول ہو جائے گا اور جس نے بھی یہ اخلاقی مقامات حاصل کر لئے وہی حسبِ استعداد خلیق نام پانے کا مستحق ہو گا جس سے صاف نکل آیا کہ انسانی سعادت و برتری کے ننانوے نام جن سے ان کا اخلاقی معیار بنتے ہیں یا آپ کے الفاظ میں معیارِ اخلاق قائم ہوتا ہے اور پھر ان معیاری اخلاق سے افعال کا معیار قائم ہوتا ہے جس سے افعال و کردار کا معیاری قانون بنتا ہے تب کہیں جاکر ان جزئیات کے معیاری ہونے کا مقام آتا ہے کہ تو خون مت کر' تو زنا مت کر' تو چوری مت کر'

پس جو چیزیں معیار اخلاق سے تیسرے نمبر پر آتی تھیں اور خود معیار اخلاق بھی نہ تھیں بلکہ معیار اخلاق کا تیسرے درجہ کا نچلا اثر تھیں آپ نے پہلے ہی قدم پر انہیں کو معیار اخلاق بنا کر انجیل کے معیارِ اخلاق کا ڈھول پیٹ دیا درحالیکہ نہ وہ معیار اخلاق تھیں نہ معیارِ اخلاق کا بلا واسطہ اثر تھیں۔ اور جس قرآن نے معیار اخلاق کا مکمل نقشہ پیش کرتے ہوئے درجہ بدرجہ اس کے آثار دکھلائے اور پھر اخلاقی نظام کو کامل طریق پر جزیاتی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کیا اخلاق کا سرچشمہ متعین کیا اخلاق کی انواع متعین کیں اخلاق کے عنوانات متعین کئے سرچشمہ اخلاق سے اخلاق لینے کے طریقے بتلائے

ان طریقوں پر چلنے کی تدبیریں مشخص کیں اور دنیا ان پر چل کر فائز المرام ہوئی مگر اسی سے آپ نے اخلاق آفرینی کی کلیتہً نفی کردی اس سادگی اور سادہ لوحی یا دنیا کو مبتلائے فریب کرنے کو آخر کس نام سے یاد کیا جائے بہر حال اخلاق کی تفصیلی تعلیم سے جس حد تک اسلام نے دنیا کو علماً و عملاً آشنا کیا اور اخلاق کا علمی و عرفانی نظام قائم کر کے عمل کی تدبیریں بتلائیں دنیا کی کوئی ملت اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

اخلاق کی اسی تعلیم کی نیچے اگر اسلامی اخلاق کی تاریخ دیکھی جائے تو۔ عمل کا علم سے سر مو تفاوت نظر آئے گا اور واضح ہوگا کہ اسلام کی یہی وہ پاکیزہ اخلاق اور ان سے پیدا شدہ پاکیزہ اعمال تھے جن کا نمونہ بنکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور آپنے اپنے صحابہ کو تربیت دے کر ان اخلاق پر ڈھالا جن کی مخفی قوت سے عرب کے گردن کش رام ہوئے اور سرکشوں میں اسلام کی روح دوڑ گئی پھر یہ لوگ جہاں بھی پہونچے وہاں چند چند نفر نے ملکوں اور قوموں کو اپنی اخلاقی تلوار سے فتح کر لیا چین میں آٹھ صحابہ تاجر کی حیثیت سے گئے تو آج وہاں آٹھ کروڑ پرستاران توحید موجود ہیں۔

یہی صورت اسلام پھیلنے کی روم و شام میں بھی نظر آتی ہے تلوار اگر اٹھی تو فتنہ پردازی کے خلاف اٹھی نہ کہ غیر مذہب ہونے کے خلاف، پھر صحابہ کی تربیت سے بعد کے لوگ اولیا رامت بن کر ہر دور میں چمکے جنہوں نے خدا کی مخلوق کو اخلاق فاضلہ کا درس دیا

چنانچہ اسلام کے ایک ایک دور میں ہزارہا علمار فقہا عرفار حکمار
ادبار اور شعرار اخلاق مجسم بنکر نمایاں ہوتے رہے جن میں سے ایک ایک
فرد ایک ایک امت کی برابر ثابت ہوا کہ جہاں بھی بیٹھ گیا اس نے
اپنی اخلاقی قوتوں سے خطے کے خطے ایمان و اخلاق سے رنگ دیئے
کروڑوں انسانوں کے لئے اپنے اخلاق و کردار سے نجات کی راہیں
کھولدیں بقول مسٹر آرنلڈ مصنف پریچنگ اوف اسلام صرف
ایک خواجہ معین الدین اجمیری ہی کو دیکھو تو تنہا اُن ایک ہی کے
دست حق پرست پر ننانوے لاکھ انسان مشرف باسلام ہوئے
اور جو تعداد ان کے خلفار کے ہاتھ پر ایمان لائی وہ اس کی علاوہ
ہے جس سے آج ہندوستان میں کروڑوں انسان اسلام کے حلقہ
بگوش نظر آرہے ہیں یہ اخلاق و علم کی تاثیر نہ تھی تو اور کیا تھی
ورنہ اِن فقیروں کے ہاتھ میں تلوار کہاں تھی ؟

اس طرح ہزارہا صوفیار ہندوستان میں نظر پڑینگے جنہوں نے
اخلاقی خانقاہوں اور تربیت گاہوں کا نظام قائم کرکے ہندوستان
کے طول و عرض میں اسلامی اخلاق پھیلائے اور لوگوں کو ان اخلاق
سے دائرہ اسلام میں داخل کیا پھر ان بزرگوں کی جد وجہد اور سعی کا
دائرہ اخلاق کے صرف عملی پہلو تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ امت
کے ان حکمار نے اخلاقی تربیت کے ساتھ علمی طور پر ان اخلاق کے
حقائق بھی کھولیں ان کا تجزیہ کرکے ان کے معنوی درجات و مراتب

بھی واضح کئے ان کے اسباب و آثار پر بھی روشنی ڈالی اور انہیں حاصل کرنے کی نہایت جامع اور سہل طریقے بھی بتلائے ان پر لوگوں کو ٹرینڈ بھی کیا جس سے اخلاق نے اسلام میں ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر لی جس کا نام تصوف ہوا اور اس کے تحت اخلاقیوں کی ایک عظیم جماعت نمایاں ہوئی جس کا نام صوفیا رہوا

تعجب ہے کہ دنیا کے ہر دور میں اسلام کے اخلاق اس کے فن اخلاق اس کے طبقات اخلاق اور رجال اخلاق کا غلغلہ مچتا رہا اور دنیا کے اس کنارے سے اس کنارے تک یہ آوازے گونجتے رہے اور ان کے تاریخی آثار دنیا کے سامنے آتے رہے لیکن جناب کے کانوں تک ماضی و حال کی اس تاریخ کی کوئی بھی آواز نہیں پہونچی بلکہ اس کے برعکس آپ کے علم میں اچانک یہ آگیا اور معلوم نہیں کہاں سے آیا کہ اسلام میں اخلاق کا کوئی معیار ہی نہیں اور نہ ہی قرآن و حدیث نے اخلاق کا کوئی معیار اور نظام پیش کیا۔

انجیل کے مذکورہ دس احکام سے جو مبتدیوں کے احکام ہیں اور جن پر بحث ہوتی چلی آرہی ہے تو اخلاقی معیار قائم ہوجائے لیکن حدیث رسول نے باوجودیکہ خود ان احکام کی تفاصیل کو بھی ستّر سے اوپر شعبوں میں منقسم کر کے بیان کیا جو منتہیوں کے اخلاق ہیں اور پھر ان تفصیلی احکام کو قرآن کریم نے اخلاق سے اخذ کر کے ان کے ایک ایک جزو کی الگ الگ تفصیل کی اور پھر قلوب میں

ان کے جاگزیں بنانے کے مکمل طریقے مرتب کر کے پیش کئے، اسلام میں ہی اخلاق کا کوئی بھی اسلامی معیار قائم نہ ہو تو اسے بے خبری کہا جائے یا خبر کے باوجود ایک طرفہ رائے زنی کہا جائے جس کا دوسرا نام تعصّب ہے۔ لیکن میں آپ کے احترام میں اسے تعصّب کے بجائے بے خبری اور ناواقفی ہی پر محمول کئے لیتا ہوں جیسا کہ ابتدا میں بھی یہی عرض کر چکا ہوں کیونکہ آپ نے ننانوے اخلاق کا نام حیرت سے سنا اور تحریر فرمایا کہ آخر وہ قرآن میں کہاں ہیں اور سب نہیں تو پانچ سات ہی دکھا دیئے جاویں۔ ظاہر ہے کہ یہ حیرت لاعلمی ہی کی دلیل ہو سکتی ہے۔ اور لاعلمی بھی ایسی کہ جناب کو نہ صرف ان اخلاق کا قرآن میں ہونا ہی معلوم نہیں بلکہ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ سرے سے اخلاق کی ان اصولی انواع ہی کا پتہ نہیں ہے ورنہ ننانوے کا نام سن کر اتنی غیر معمولی حیرت کا اظہار نہ فرماتے کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جب عالم انجیل (پادری) کو ان اصولی اخلاق کا پتہ نہیں تو یہ اس کی بھی دلیل ہو سکتی ہے کہ انجیل میں بھی ان انواع اخلاق پر کوئی کمل روشنی نہیں ڈالی گئی بلکہ صرف چند مخرّب اخلاق اعمال چوری، زنا، قتل وغیرہ کے موٹے موٹے احکام بتلا دیئے گئے انہیں کو انجیلی حضرات نے معیار اخلاق سمجھ کر انجیل کا تفوق جتانا شروع کر دیا درحالیکہ عرض کیا جا چکا ہے کہ نہ وہ معیار اخلاق ہیں اور نہ ہی ان سے اصولِ

اخلاق اور نظام اخلاق پر کوئی روشنی پڑتی ہے۔

بہر حال والا نامہ پڑھ کر گمان یہی ہوتا ہے کہ اسلام کے فن اخلاق تاریخ اخلاق اور اُن اخلاق کے بے شمار پاکیزہ نتائج کے حالات پڑھنے یا سننے کا آپ کو اتفاق نہیں ہوا جس سے اسلامی اخلاق کے معیار کے بلند پایہ ہونیکا کوئی نتیجہ آپ کے سامنے آسکتا۔ ادھر آپ کے اُن معلومات اور انکی سند کا ہم خدام اسلام کو اب تک بھی کوئی علم نہ ہو سکا جن سے آپ نے اسلام کے اخلاقی معیار کے بارے میں پستی کا یہ نتیجہ نکالا ہے تاہم تعصب کے بجائے اُن امور سے آپ کی بے خبری مانکر بھی جس چیز پر حسرت و تعجب ہے وہ یہ ہے کہ لاعلمی کا اثر استفسار ہونا چاہیے تھا نہ کہ اعتراض۔ کیوں کہ لاعلمی سے اعتراض نہیں پیدا ہوتا سوال پیدا ہوتا ہے اس لئے مناسب یہ تھا کہ آپ اعتراض اور طعن کا راستہ چھوڑ کر تحقیق حال فرماتے اور علم سے پہلے اسلام یا اس کے کسی جزیہ پر کوئی بھی مثبت یا منفی حکم نہ لگاتے۔ بہر حال اب جبکہ اخلاقِ الٰہیہ اور ان سے حاصل شدہ اخلاق نبویہ اور ان سے مستفید شدہ اخلاق اولیاء اور ان سے ظاہر شدہ فن اخلاق اور امتہ میں اس سے قائم شدہ نظام اخلاق کا اجمالی خاکہ آپ کے سامنے آچکا اور اخلاق ربانی کی پانچ سات مثالیں نہیں بلکہ کل کی کل ننانوے کے عدد کی ساری ہی مثالیں آپ کے علم میں لے آئی گئیں اور آپ ہی کی فرمائش کے مطابق قرآن ہی سے لائی گئیں تو مجھے امید ہے کہ اسلام میں معیار اخلاق کے اس تفصیلی علم کے بعد

آپ اپنے اس اعتراض کو واپس لے لیں گے کہ "اسلام میں معیارِ اخلاق کا کوئی پتہ نشان تک نہیں ملتا" بلکہ آپ جیسے منصف مزاج انسان سے توقع ہونی چاہیئے کہ آپ اس سے استفادہ کرنے میں بھی دریغ نہ فرمائیں گے، وباللہ التوفیق۔

دوسرا اعتراض

آپ کے دوسرے اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ لے پالک کی بیوی سے نکاح بمنزلہ زنا کے ہے جو انتہائی درجہ کی بداخلاقی ہے اِسلام نے اسے جائز رکھکر گویا معاذاللہ زناکاری کا ایک "مہذب" قسم کا راستہ کھول دیا ہے آپ نے اُس کا عدم جواز ثابت کرنے کے لیے تین چیزوں سے سہارا پکڑا ہے بائبل ۔ رواج اور قرآن اِن تینوں حجتوں سے پیدا کردہ اعتراض کا خلاصہ آپ ہی کی "مہذب" تعبیر میں یہ ہے ۔

(الف) اسلام میں لے پالک یا متبنٰی کی بیوی سے نکاح کس طرح جائز رکھا گیا اور خود پیغمبر صاحب نے اپنے لے پالک (زید بن حارثہ) کی بیوی (زینب بنت امیمہ رضی اللہ عنہا) سے کس طرح نکاح کر لیا جبکہ انجیل میں ہے کہ "تو پڑوسی کی بیوی کا لالچ نہ کرنا" کیا خدا خود اپنی دی ہوئی شریعت یعنی انجیل کے اس (مذکورہ) حکم کو اس لے پالک کی جورو یعنی اپنی بہو سے نکاح کرنے کی اجازت سے خود ہی باطل کر سکتا ہے ؟ ہرگز نہیں۔

(ب) قرآنی زمانہ سے پہلے اور اہل قرآن کو چھوڑ کر باقی تمام اقوام میں

یہ دستور رہا ہے اور آج کی تاریخ میں بھی ہے کہ جس لڑکے کو گود لے لیا وہ لے پالک بنکر حقیقی بیٹے کے درجہ کو پہونچ گیا اور ٹھیک اسی طرح اسکی بیوی کو بھی وہ درجہ اور مرتبہ حاصل ہو گیا جو اپنے حقیقی بیٹے کی بیوی کو ہوتا ہے۔

(ج) خود قرآن نے بھی اس لے پالک کی بیوی سے نکاح کو کچھ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ پڑھیے سورۂ احزاب خدا اپنے رسول سے فرماتا ہے تو چھپاتا تھا دل میں ایک بات۔ اللہ کرنا چاہتا تھا اسکو ظاہر۔ تو ڈرتا تھا انسان سے۔ ڈرنا چاہیے صرف اللہ ہی سے۔ یہانتک کی عبارت سے تو ایسا معلوم پڑتا ہے کہ متکلم خاطر کی کوئی ایسی بات بتانا چاہتا ہے جس کو ظاہر کرنے سے خاطر کو ڈر لگتا تھا لیکن حقیقت میں خاطر کے دل میں اس بات کو پورا کرنے کی لو لگی ہوئی ہے لیکن خوف اور ڈر کی وجہ سے اس بات کو عمل میں لانے کی ہمت نظر نہیں پڑتی ڈر ہے کہ کہیں لوگ ابتک کی کری ہوئی محنت پر پانی نہ پھیر دیں گویا معاذ اللہ قرآن اور رسول کی یہ باہمی سازش تھی کہ جو قابل اعتراض بات تھی رسول اسے معاذ اللہ کر گزرے اور جب کر ہی گزرے تو قرآن نے بھی اس کی سند جواز پیش کردی گو قرآن اس سے بھینچ بھی رہا ہے۔ اور اس نے معاذ اللہ رسول کے اس فعل کے ناروا ہونیکی وجہ سے خود رسول کے قلب پر جو کیفیت گزری اسے بے تکلف کھول بھی دیا جس سے گویا یہ نتیجہ نکلا کہ بائبل اور عام رواج کی طرح قرآن کی

نگاہ میں بھی یہ لے پالک کی بیوی سے نکاح کوئی اچھی بات نہ تھی مگر بہرحال اسے اپنے رسول کا بھرم رکھنا تھا تو سند جواز اُسے لانی ہی تھی تو وہ لیکر آگیا اور آخر کار سند جواز اتر ہی آئی۔

آپ کے اعتراضات کا خلاصہ آپ ہی کے مہذّب عنوان اور شائستہ تعبیر میں یہ تھا جو عرض کیا گیا جس میں خدا اور رسول اور دین کسی کو بھی اعتراض سے نہیں چھوڑا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم کے ہاتھ میں مستند دین نہ رہے اور تحریف شدہ کتاب پر دین کا دار و مدار رہ جائے جس کی نہ سند ہو نہ روایت اور جس میں وقتاً فوقتاً خواہشاتِ قوم اور حسب ضرورت زمانہ ترمیم و تنسیخ کی بھی عمل میں آتی رہی ہو تو اس قوم میں دینی مذاق اور خدا اور اس کے پیغمبر کے معاملات کو صحیح صحیح سمجھنے حدود کو قائم رکھنے اور ادب و تہذیب سے احتجاج کرنے کا ذوق کہاں سے آئے نیز جو لوگ خود اپنی آسمانی کتاب کو بدل سدل کر مشتبہ اور غیر واقعی بنادینے سے نہ چوکیں وہ کسی دوسرے مذہب کے کسی بھی مذہبی حکم یا خبر میں کتر بیونت کرنے سے آخر کیوں شرمائیں؟

چنانچہ اسی لے پالک کے قصّہ میں آپ نے واقعہ کی ساری تاریخ کے سلسلہ کو حذف کر کے جوان شبہات کا خود ہی قرار واقعی جواب تھا واقعہ کا ایک ناتمام ٹکڑہ لیکر بقیہ تاریخ نہ صرف یہ کہ حذف کر دی بلکہ خود اپنے ذہن سے ایک نئی تاریخ تراش کر پیش کر دی اور کمال یہ کیا کہ اُس تراشیدہ تاریخ کو قرآن کے سر رکھ کر اور قرآن ہی کی آیت پڑھ کر

پیش فرمایا گویا یہ اعتراض قرآن پر آپ نہیں کر رہے ہیں بلکہ خود قرآن اپنے اوپر اعتراض کر رہا ہے حالانکہ آپ کا اخلاقی اور مذہبی فرض یہ تھا کہ آپ حضرت زینب کے نکاح کے واقعہ کو پہلے اسلامی تاریخ سے صحیح صحیح نقل کرتے پھر اس کا جو جزو قرآنی اصول اور اسکی تاریخ کے خلاف نظر پڑتا اس پر اعتراض کرتے۔ نہ یہ کہ الفاظ تو قرآن کے لیے اور اس کا مفہوم خود تجویز کر لیا واقعہ کا ایک جزر تو تاریخ سے لیا اور بقیہ اجزار خود تصنیف فرمالئے دعوی تو قرآن کے الفاظ سے نکالا اور اس کی نوعیت کی توضیح خود اپنے ذہن سے کی اور جب غلط ذہن سے یہ غلط منصوبہ بنکر سامنے آگیا تو اسے قرآنی منصوبہ کہکر اس پر اعتراضات کی تعمیر خود ہی کھڑی کر لی۔ سوچیے کہ یہ اعتراض آپ نے قرآن پر کیا ہے یا خود اپنے اوپر کوئی شخص قرآن کے غلط معنی تجویز کر کے اس پر اعتراض کرے تو وہ اس غلط مفہوم پر اعتراض ہے جو خود اسی کے غلط ذہن سے نکلا ہوا ہے نہ کہ قرآن پر۔

میں نے اسی کے پیش نظر تمہید میں عرض کیا تھا کہ کسی مذہب کے قوانین واحکام اور اخبار و واقعات کو سوچتے وقت خود اسی مذہب کی تاریخ کو جو پیغمبر اور ان کے اولین جانشینوں کی زندگی اور روایت سے بنتی ہے اصولاً سامنے رکھنا ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر اس حکم و خبر کا صحیح رنگ وروپ اور واقعاتی پس منظر سامنے نہیں آسکتا۔ مگر افسوس ہے کہ آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ آپ کا ذہن فہم کے بجائے وہم کا شکار ہو گیا۔ اس لئے میرے لئے ضروری ہو گیا کہ میں آپ کے شبہات کے جوابات

کے لئے اس واقعہ کا اس حد تک پیش کردوں جس حد تک قرآن نے
اس کی طرف جامع اشارے ضروری سمجھے ہیں اور ان اشارات کی وضاحت
قرآن کے بیان یعنی حدیث نبوی نے کی ہے تاکہ اصول و واقعات کی اس
قرآنی ترتیب اور اس کے تحت اس کے تاریخی آثار اور شرعی بیان سے
اُن غیر واقعی بہتانوں کی قلعی کھل جائے لیکن اس سے پہلے کہ میں قرآنی
آیات کے تحت حضرت زید کے واقعہ کی تفصیلات عرض کروں ضروری
سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں سب سے اول آپ کی بیان کردہ حجتوں
پر نظر ڈالوں جو آپ نے لے پالک کے حقیقی بیٹا بن جانے اور اس کی
بیوی کے منھ بولے خُسر پر اس کے حرام ہو جانے کے سلسلہ میں پیش کی
ہیں اس کے بعد اس بارہ میں قرآنی اصول حجتیں اور قرآنی تاریخ پیش
کروں گا جس سے حقیقت حال واضح ہو جائیگی۔

آپ نے مذکورہ دعوٰی کے ثبوت میں اسلام کے خلاف تین حجتیں دی ہیں
ایک[۱] یہ کہ بائبل کا حکم ہے کہ "تو پڑوسی کی بیوی کی لالچ نہ کرنا" دوسرے[۲] یہ
کہ دنیا کی عام قوموں کا دستور چلا آرہا ہے کہ موتھ بولا بیٹا جب موتھ
سے بیٹا بول دیا جائے تو وہ حقیقی بیٹا بن جاتا ہے اور اس کی ساتھ معاملہ
بھی حقیقی بیٹوں ہی کا ضروری ہو جاتا ہے جس کو دنیا کی قومیں عمل میں
لاتی رہی ہیں تو پھر اسلام نے اس حکم انجیل اور اس عام رواج کے
خلاف لے پالک کی بیوی سے لے پالک کے موتھ بولے باپ کو نکاح
کی اجازت کیسے دیدی؟ تیسرے[۳] یہ کہ خود قرآن بھی لے پالک کی بیوی

سے نکاح کر لینے کے فعل کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے جبکہ اس جذبہ نکاح کو پیغمبر کے دل میں چھپائے رکھنے پر اس نے ناپسندیدگی کا لب و لہجہ اختیار کیا ہے۔ پہلی دو حجتیں یعنی "بائبل" اور "قومی رواج" مسئلہ کی اصولی حیثیت سے متعلق ہیں اور آخر کی الزامی حجت یعنی قرآن مسئلہ کی واقعاتی حیثیت اور عین اس جزوی مسئلہ سے متعلق ہے اس لئے آپ کی پہلی دو حجتوں کا جواب تو اصولی طور پر عرض کیا جائیگا اور آخر کی حجت اور اس سے پیدا کردہ شبہات کا جواب واقعہ کی تاریخی نوعیت سامنے لا کر خود واقعہ سے دیا جائے گا وباللہ التوفیق

لے پالک کے بارہ میں بائبل سے استدلال

(الف) جہانتک بائبل کا تعلق ہے میں بادب گزارش کرونگا کہ اگر واقعی اصلی بائبل کا کوئی وجود دنیا میں ہے تو اول تو اس دور کے کسی بھی شخص پر اور بالخصوص پیغمبر اسلام علیہ السلام پر انجیل کا کوئی مقولہ حجت نہیں ہو سکتا جب کہ اس انجیل کی صحت ہی محل کلام ہے اور اس میں من مانی تحریفات کر لی گئی ہیں جس سے وہ آج ایک جعلی دستاویز کی پوزیشن میں ہے پھر اگر وہ کسی درجہ میں صحیح النسب مان بھی لی جائے تب بھی پیغمبر اسلام پر تو کسی بھی درجہ میں اس کا کوئی جملہ بھی حجت نہیں بن سکتا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف مستقل نبی و رسول ہی نہیں بلکہ خاتم النبیین اور خاتم المرسلین بھی ہیں جنکی شریعت نہ صرف

آخری اور مکمل شریعت ہی ہے بلکہ پچھلی تمام شریعتوں کے لئے ناسخ بھی ہے اور دنیا میں اس کے آجانے کے بعد نجات کا اسی میں انحصار بھی ہے جیسا کہ یہ امر عقلی و نقلی دلائل سے اپنی جگہ ثابت شدہ ہے یہاں اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں ۔ پس ایک مستقل اور ناسخ شرائع پیغمبر دوسری شریعتوں کا تابع کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی پچھلی شریعت کے جزوی احکام سے اس پر حجت قائم کی جائے ؟

دوسرے یہ کہ نسخ شرائع کے اصول کے تحت پچھلی منسوخ شدہ شریعتیں تو محمدی شریعت کے تابع ہو سکتی ہیں لیکن اس کے برعکس شریعت محمدیؐ منسوخ شریعتوں اور وہ بھی خود اپنی ہی منسوخ کردہ شریعت کے تابع کیسے ہو جائیگی ۔ ماتحت عدالتیں تو ہائی کورٹ کے تابع ہو سکتی ہیں کہ خواہ وہ ان کے فیصلوں کو برقرار رکھے یا منسوخ کر دے لیکن قصہ برعکس نہیں ہو سکتا کہ فیصلوں میں ہائی کورٹ ماتحت عدالتوں کے تابع ہو جائے ۔ اور ان ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کو حجت بنا کر ہائی کورٹ کے فیصلوں کے خلاف بصورت اعتراض پیش کیا جائے ۔

تیسرے یہ کہ اگر کسی درجہ میں بائبل کے اس مقولہ کو حجت مان بھی لیا جائے کہ تو پڑوسی کی بیوی کا لالچ نہ کرنا تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ متبنّیٰ کی بیوی سے نکاح کرنے کے مسئلہ کو پڑوسی کی بیوی کے لالچ سے کیا تعلق ہے ؟ وہاں ایک شخص کی منکوحہ بیوی کے لالچ سے روکا جا رہا ہے جس میں پڑوسی کی قید بھی محض تاکید و اہمیت کیلئے ہے ورنہ کسی کی بھی بیوی

کا لالچ خواہ وہ پڑوسی کی ہو یا غیر پڑوسی کی کسی حال میں بھی جائز نہیں ہو سکتا اور یہاں ایک شخص کی مطلّقہ سے نکاح کا مسئلہ زیرِ بحث ہے جو فی نفسہ ہر مذہب وملّت میں جائز ہے تو کہاں پڑوسی کی بیوی اور کہاں کسی کی مطلّقہ؟ پھر وہاں زنا سے روکا جا رہا ہے جو ہر مذہب میں ناجائز ہے اور یہاں سوال نکاح کا درپیش ہے جو کسی مذہب میں بھی ممنوع نہیں ہے تو کہاں زنا اور کہاں نکاح؟ آخر ان دونوں کو ایک دوسرے پر قیاس کرنے کے لئے کوئی تُک بھی تو ہونی چاہیئے۔ پالک کی مطلّقہ اور پڑوسی کی منکوحہ بیوی میں کوئی مشترک علّت تو ہونی چاہیئے جس سے ایک کو دوسری پر قیاس کرکے ایک کا حکم دوسری کی طرف منتقل کیا جائے۔ یہاں تو دونوں کے دو مسئلے الگ الگ نوعیتوں کے ہیں ایک منکوحہ کا اور ایک غیر منکوحہ کا تو یہ آخر کونسا اجتہاد و قیاس ہے کہ دو متبائن اور جدا جدا نوعیتوں کی اشیاء میں قیاس کے ذریعہ ایک کا حکم دوسری میں پہونچا دیا جائے؟ یہ تو ایسا ہی ہے جیساکہ کسی کی بیوی کو اس کی ماں پر قیاس کرکے بیوی کے حرام ہونیکا فتویٰ دیدیا جائے جب کہ ان میں کسی بھی علّت یا بنیاد کا اشتراک نہیں ہے بس جیسے اس اجتہاد کو عقلمندی کا استدلال کہا جائے گا ایسے ہی پڑوسی کی بیوی پر کسی کی مطلّقہ کا (خواہ وہ مطلّقہ پالک کی بیوی تھی یا کسی اور کی) جب کہ ان دونوں میں کسی بھی مشترک علّت کا وجود نہیں قیاس کرنا اور خواہ مخواہ ایک کا حکم دوسرے پر لگا دینا خاص ہی قسم کی عقلمندی کا اجتہاد ہو گا

اگر یہ عقلمندی کرنی ہی تھی اور بائبل کی ہی حکم سے پیغمبر اسلام کے کسی فعل کو ناجائز ٹھیرانا تھا تو آپ انجیل سے لے پالک کی بیوی سے نکاح کے حرام ہونے کا حکم پیش فرماتے تو اس پر غور کیا جاتا لیکن آپ پیغمبر کے فعل کے خلاف انجیلی حکم کی بجائے خود اپنا قیاس اور وہ بھی مع الفارق یعنی مطلقہ بیوی کا منکوحہ بیوی پر قیاس پیش فرمائے ہیں جو سرے ہی سے حجت نہیں چہ جائیکہ رسول خدا پر حجت ہو جس میں قیاس کی ابتدائی شرط اشتراک علت ہی ندارد ہے۔ تو کہاں بائبل کی حجت اور کہاں آپ کے ذاتی تخیل کی حجت ؟ جو اس کی دلیل معلوم ہوتی ہے کہ خود انجیل میں لے پالک کے بارہ میں کوئی فارمولا ہی موجود نہیں جس سے آپ کو انجیل کے ایک غیر متعلقہ حکم پڑوسی کی بیوی کے لالچ کی آڑ پکڑنی پڑی۔ اس لئے یہ خیالاتی حجت اس قابل بھی نہیں کہ اس پر غور بھی کیا جائے۔ ہاں بائبل کا کوئی صریح حکم ہوتا تو وہ قابل توجہ ہوتا۔ اس لئے آپ کا دعویٰ بے بنیاد رہ جاتا ہے جب کہ یہ آپ کی پیش کردہ حجت اس کی حجت نہیں ہو سکتی۔

لے پالک کے بارہ میں رواج سے استدلال

(ب) اسی طرح آپ نے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے بطور حجت دنیا کی عام قوموں کا رواج پیش کیا ہے کہ جب کسی کو متبنّیٰ بنا لیا جاتا تھا اور لے پالک کو بیٹا کہہ لیا جاتا تھا تو وہ دنیا کی قوموں

کے نزدیک حقیقی بیٹا بن جاتا تھا اور اس کی ساتھ حقیقی بیٹوں ہی جیسا۔ معاملہ کیا جاتا تھا تو ساری دنیا کے اس عام دستور کے خلاف اسلام کا یہ حکم کیسے قابلِ تسلیم ہو سکتا ہے کہ متبنّیٰ کی مطلقہ بیوی سے متبنّیٰ نے والے باپ کا نکاح جائز ہو۔

لیکن آپ کو اعتراض کرتے وقت اس پر بھی غور فرما لینا چاہیئے تھا کہ یہ آپ کی حجت اسی وقت چل سکتی ہے کہ آپ بطور اصول کے پہلے یہ تسلیم کریں اور کرائیں کہ مذاہب اور شریعتیں دنیا میں رواجوں کی پابندی کرانیکے لئے آتی ہیں اور جس قوم میں جو بھی رسم رائج ہو شریعتیں اسے باقی رکھ کر اس کی حفاظت کرنے کے لئے آئیں حالانکہ یہ بنیاد ہی سرے سے غلط اور پوچ ہے۔ شریعتیں دنیا میں بھیجی ہی اس لئے گئیں ہیں کہ قوموں کے غلط رسوم اور رواج کو مٹا کر ان کی جگہ خدا کا قانون جاری کریں۔ کیوں کہ رواج قوموں کے تراشیدہ ہوتے ہیں اور شریعت خدا کا تجویز کردہ قانون ہوتا ہی اور ظاہر ہے کہ انسانوں کی روحانیت خود اپنے تراشیدہ خیالات ورواجات سے نہیں بن سکتی بلکہ خدائی قانون سے نشو و نما پاتی ہے ورنہ دنیا میں انبیاء و رسل اور شرائع و کتب کے بھیجے جانیکی ضرورت ہی نہ تھی۔ کونسا زمانہ رواجوں اور قومی و وطنی رسوم سے خالی رہا ہی یا رہیگا ؟ بلکہ دنیا کی قومیں طبعاً جس قدر اپنے رواجوں اور رسموں پر پختہ ہوتی ہیں اُتنی شرعی قوانین پر قائم نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ وہ شرعی

قوانین کو ٹھکراتی ہی اپنے رواجوں کی حمایت میں ہیں اور اسی لئے انبیار علیہ السلام کو ان کی اصلاح میں سخت ترین دشواریاں اور مشکلات پیش آئیں ہیں۔ ہمیشہ انبیار نے رسم ورواج چھڑواکر انھیں خدائی راہ پر لگانا چاہا اور وہ اپنی رواجی پگڈنڈیوں اور باپ دادا کی ریت کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئیں اور برسرپیکار آئین نبیوں سے لڑائیاں ٹھانیں اور مقابلہ کئے۔ یہ ساری لڑائیاں وہی قومی دستور ورواج کو نہ چھوڑنے اور خدائی شریعت کو اس کے مقابلہ پر قبول نہ کرنے ہی کی وجہ سے ہوتی رہی ہیں اگر شریعتیں رواجوں کی پابندی کرانے کے لئے آئی ہوتیں تو قوموں اور نبیوں میں لڑائیاں کیوں ٹھنتیں ؟ اور انبیار سے مقابلہ کرنے پر عذاب الٰہی کیوں آتا۔ اگر انبیا رھی ان رواجی رسموں سے راضی رہا کرتے تو نہ عذاب خداوندی سے پہلی قومیں ختم ہوتیں نہ نئی پیغمبروں سے نئی قومیں بنتیں۔ بلکہ آپ کے اس مفروضہ اصول پر تو انبیار اور شریعتوں کے آنیکا کارخانہ ہی ختم ہو جانا چاہیئے تھا کیوں کہ قومیں رواجوں کی طبعاً خود ہی پابند ہوتیں ہیں تو ان کی پابندی کرانے کے لئے انبیار ورسل کا آنا اور آسمانی شریعتوں کا اترنا عبث اور تحصیل حاصل ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ جب آپ کے مفروضہ اصول کے یہ غیر معقول اور غلط نتائج نکلتے ہیں تو کیا بے تکلف نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کا یہ مفروضہ اصول ہی سرے سے غلط ہے کہ کسی شرعی حکم کے مقابلہ میں دنیا کی قوموں کا رواج بطور حجت پیش کرنے کے قابل ہو۔ اندریں صورت اسلام

میں لے پالک کی مطلقہ بیوی سے لے پالک کے منھ بولے باپ کے نکاح
کا شرعی حکم اگر ساری دنیا رواجوں کے بھی خلاف ہو تب بھی اس کے حکم
شرعی ہونے پر ان رواجوں سے کوئی آنچ نہیں آسکتی یہ شرعی حکم ہی
بہرصورت حجت رہیگا رواج کی پیش نہ چل سکیگی اور وہ کسی درجہ میں
بھی حجت نہ ہوگا۔ بلکہ یہ کہا جائیگا کہ یہ حکم شرعی آیا ہی تھا اس غلط
رواج کو مٹانے کے لئے اس لئے بائبل کا وہ پڑوسی کی بیوی والا مقولہ
(جسے بے محل پیش کیا گیا ہے) یا یہ رسم ورواج کا قصہ ہو نہ کوئی معقول
حجت ہے نہ اس مسئلہ میں پیش کرنے کے قابل ہے

لے پالک کے بارہ میں قرآن سے قرآن کیخلاف استدلال

بائبل اور رواج کی پوچھ اور پچر حجتوں کے بعد آپ نے قرآن
کو قرآن کیخلاف استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور اس رنگ سے
اُسے مستقلاً مورد طعن وملامت دکھانیکی طرف توجہ فرمائی۔ اس اعتراض
کے سلسلہ میں جہانتک آپ کے ذاتی جذبات کا تعلق تھا آپ کو اختیار
تھا کہ جس لب ولہجہ سے بھی آپ چاہتے اُن کا اظہار فرمالیتے وہ آپکے
ذاتی فعل اور ذاتی تہذیب کا آئینہ ہوتا۔ جو غیر متوقع نہ ہوتا لیکن غضب
یہ ہے کہ آپنے اپنے ذہنی افسانہ کو دوسروں کی مذہبی الواح کے سر رکھکر
سنانا چاہتے ہیں کہ قرآن بھی گویا ان وسوسوں میں آپ کی ساتھ ہے
کہ پیغمبر اپنے لے پالک کی بیوی سے نکاح کا جو مخفی خیال اپنے دلمیں چھپائے

ہوئے تھے وہ معاذ اللہ عیب ناجائز اور نفسانی جذبہ تھا جسے عیب ہی کی طرح پیغمبر نے معاذ اللہ چھپانیکی کوشش کی مگر بالآخر خدا نے اسے ظاہر کر دیا۔

یہی وہ آپ کی الزامی حجت ہے جس میں آپ نے بنام قرآن واقعات میں اپنے ذہنی اختراعات کو شامل کر کے واقعہ کی صورت کو مسخ کرنے اور محرّف بنانے کی صورت اختیار کی ہے جیساکہ نصرانی اقوام کا قومی مزاج خود اپنی آسمانی کتاب کے بارہ میں بھی یہی رہا ہے اور وہ کبھی بھی اس قسم کی کتر بیونت سے نہیں شرماتے۔

یحرفون الکلم عن مواضعہ ونسوا حظاً مما ذکروا بہ

وہ لوگ کلام کو اسکے مواقع سے بدلتے ہیں اور وہ لوگ جو کچھ انکو نصیحت کی گئی تھی اس میں سے ایک بڑا حصہ فوت کر بیٹھے

آپ کے ان الزامی اعتراضات کا نمبروار خلاصہ (جو آپنے قرآن سے اخذ کر کے الزاماً پیش کئے ہیں تقریباً آپ ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ:-

(۱) پیغمبر نے ایک موزوں جوڑے یعنی زید و زینب رضی اللہ عنہما کو توڑنے اور زینب سے خود اپنا نکاح کر کے معاذ اللہ غیر موزوں جوڑا بنانے کی فکر کی۔

(۲) پیغمبر نے اس خیال (نکاح زینب) کو دل میں چھپائے رکھا اور لوگوں کے خوف سے اُسے عمل میں لانے کی ہمت نہ ہوئی کہ اسمیں کی کرائی پر پانی پھر جانیکا خطرہ تھا (گویا دل میں چور چھپا ہوا تھا معاذ اللہ)

(۳)، جب اپنی بہو لے پالک کی بیوی، پر طبیعت مچل گئی تو فوراً آسمانی وحی نے ساری روحانیت اور سچائی پر ایسا بھاری پردہ ڈالدیا کہ تمام دینداری چھپ گئی اور اپنے بیٹے کی جورو کو اپنی جورو بنانیکا حق اللہ میاں سے حاصل ہوگیا۔ گویا عمل پہلے کیا قانون بعد میں اُترا جس کی آڑ پکڑ لیگئی

(۱) جب کہ محمد صاحب کے پاس پہلے ہی سے دسیوں جوروئیں تھیں تو معلوم نہیں اللہ میاں کو کونسی فکر محمد صاحب کیواسطے اس نئی جورو بنانے کی دامنگیر تھی۔

(۲) اگر اللہ میاں لے پالک بیٹوں کی جورو کو اپنے والدوں کی جورو بنانے کا قرآنی قانون نہ بناتا تو کون سی نیکی کی اس دنیا میں کمی رہ جاتی نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات۔

یہ بے سروپا تخیلات جو حضرت زینب کے نکاح کے بارہ میں آپ نے اُگلے ہیں جس کا تاریخی طور پر نہ کہیں سر نہ کہیں پیر، اس قابل نہ تھے کہ اُن کی طرف کوئی سنجیدہ انسان توجہ بھی کرتا۔ لیکن آپ نے چونکہ ان اُمور کو قرآن کے سر رکھکر دنیا کے سامنے رکھا ہے جو بلاشبہ کلام الٰہی پر افترا و بہتان ہے۔ اس لیے جواب دہی کی طرف توجہ کیا جانا ناگزیر ہو گیا تاکہ ان بے سروپا تہمتوں سے کلام خداوندی کی تنزیہہ کرتے ہوئے آپ کے منشار غلط کو کھولدیا جائے کہ آیات الٰہی کے بارہ میں یہ ذہنی خرافات کن چور دروازوں سے آپ کے اندر داخل ہوئیں؟ پھر جبکہ ان بے بنیاد الزامات کی زد براہِ راست قرآنی تاریخ

پر پڑتی ہے جن سے قرآن کو داغدار بنانے کی ناکامیاب سعی کیگئی ہے اس لیئے یہ بھی ضروری ہوا کہ ان مذکورہ الزامات کی جوابدہی سے پہلے اس زیر بحث واقعہ کی تفصیل اور تاریخی ترتیب کے مناسب مقام کی ٹکڑے خود قرآن ہی کے اشاروں سے ذکر کردیئے جائیں جس سے یہ نمایاں ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نکاح کا خیال کب اور کیوں پیدا ہوا ؟ اور آپ نے اس خیال کو ابتداءً ہی کیوں نہ ظاہر فرما دیا اور یہ کہ اس کے اظہار میں لوگوں سے آپ کو کس بات کا خوف تھا ؟ اور آپ جس چیز کو چھپائے ہے تھے اور اللہ اُسے ظاہر کر دینا چاہتا تھا وہ کیا تھی ؟ اور وہ عیب تھی ؟ یا صواب تھی ؟ اور پھر درصورت صواب اسے چھپانے کی کیا مصلحت تھی اور اللہ کے اُسے ظاہر کر دینے کی کیا مصلحت تھی ؟

نیز اس اخفاءِ نبوی اور اظہار خداوندی کا اس دور کے لوگوں پر کیا اثر ہوا ؟ چونکہ یہ تمام امور ماضی کے واقعات ہیں اور دور گذشتہ کے واقعات کا پتہ قیاس اور تخمینوں سے نہیں چلایا جا سکتا بلکہ مستند اور قابلِ اعتماد نقل و روایت ہی اس کا ذریعہ ہو سکتی ہے اس لیئے لامحالہ تاریخ ہی کی طرف رجوع کرنا قدرتی بات ہے جو صاف اور غیر مشتبہ ہونی چاہیئے بالخصوص جبکہ واقعہ کا تعلق قرآن سے ہو کہ جس کی نقل و روایت کی صحت کی مثال پیش کرنے سے دنیا عاجز ہے تو اس کی تشریح اور بیان کی تفصیلات بھی عام تاریخی حوالوں کی نسبت کہیں زیادہ صاف اور مستند ہونی چاہئیں جو قرآن کے ساتھ سند و روایت میں جوڑ کھا سکیں

اور ظاہر ہے کہ وہ حدیث نبوی اور آثار صحابہ ہی ہو سکتے ہیں جو محدثین و مفسرین جیسے پاکباز اور مقدس طبقہ کی روایت کردہ ہوں کہ انکی روایات کی صحت و سند اور فنی طریق روایت کی مثال پیش کرنے سے بھی دنیا کی قومیں عاجز و درماندہ ہیں اس لئے میں آپ کے الزامات کے جوابات دینے سے قبل اس تاریخ کو اولاً قرآنی اشاروں کے تحت اسی ترتیب سے پیش کروں گا جس ترتیب سے قرآن نے اسکی طرف بلیغ اور جامع اشارے کئے ہیں اور پھر ان اشاروں کی تفصیلات احادیث و آثار کی روشنی میں عرض کروں گا تاکہ قرآن کی اشارہ کردہ واقعاتی تاریخ قرآن ہی کے بیان سے کھل جائے واقعہ کی صحیح صورت کھلجانے پر اول تو خود ہی آپ کے غیر واقعی بہتانوں کی قلعی کھل جائیگی تاہم مزید اطمینان کے لئے آخر میں نمبروار آپ کے الزامات چارگانہ کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے یہ بھی واضح کردیا جائے گا کہ آپ نے اپنے شوق اعتراض کو پورا کرنے کیلئے اس صحیح تاریخ میں کہاں کہاں اپنے ذہنی تخیلات کو بنام تاریخ داخل کرکے اس صحیح تاریخ کو مشتبہ اور مسخ کرنے کی نامبارک سعی کی، اور قرآن پر ناجائز حملے کرکے اس کی سچی تعلیمات کو بدنام کرنیکا شوق پورا کیا ہے۔ سو قرآن کی ترتیب کے مطابق احادیث کی روشنی میں اس واقعہ کا جامع خلاصہ جس کے ہر حصّہ کی نقل کے بعد میں اس سے متعلّق قرآن کا اشارہ بھی نقل کردوں گا یہ ہے کہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اللہ و رسول کی طرف سے چند در چند انعامات

سے نوازہ گیا تھا۔

(الف) اول یہ کہ حضرت زید یوں تو اپنے اصل سے ایک شریف النسب عرب تھے مگر لڑکپن میں کوئی ظالم انہیں پکڑ لیا اور غلام بنا کر مکہ کے بازار میں بیچ گیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے انہیں خرید لیا۔ بعض روایات میں ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خریدا۔ ممکن ہے کہ حضور نے انہیں حضرت خدیجہ ہی کی طرف سے بطور وکیل کے خریدا ہو جیسا کہ ان کے مال تجارت کے بارے میں آپ وکیل بھی رہے ہیں اس لئے اس خریداری کو آنحضرت کی طرف ہی منسوب کر دیا گیا ہے۔ بہر حال اس خریداری کے بعد وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ گویا یہ زبردستی کی غلامی ہی ان کے حق میں سرچشمہ انعامات ثابت ہوئی۔ جن میں کا پہلا انعام ان کا اسلام میں داخل ہونا تھا۔

(ب) کچھ دنوں کے بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو ہبہ کر دیا اور اب وہ آنحضرت کے غلام قرار پائے۔ یہ دوسرا انعام خداوندی تھا کہ ان کی نسبت آنحضرت کی طرف ہوئی اور وہ آپ کے غلام کہلائے۔

(ج) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آزاد کر دیا۔ یہ تیسری نعمت تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اُن پر مبذول ہوئی اور وہ آپ کے موالی میں شامل ہو گئے اور حضور ان کے ولی قرار پائے۔

(د) آنحضرت نے انہیں آزاد فرما کر اپنا متبنیٰ (لے پالک) بنا لیا

یہ چوتھی نعمت تھی جو انہیں آنحضرت کی طرف سے عطا ہوئی کہ وہ اِس تبنیت کی بدولت آنحضرت کے لے پالک کہلائے اور اس زمانہ کے رواج کے مطابق انہیں زید بن محمد پکارا جانے لگا۔ یہ ایک ایسی نسبت تھی جو اُن کے سوا اس دور کے کسی انسان کو میسّر نہیں ہوئی۔

(ھ) پھر شرف بالائے شرف انہیں یہ ملا کہ آنحضرت نے حضرت زینب سے ان کا نکاح کردیا جو امیمہ بنت عبدالمطلّب کی صاحبزادی اور آنحضرت کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ قریش کے اعلیٰ خاندان سے تھیں حسین و جمیل اور باوجاہت تھیں حسب نسب دونوں کے لحاظ سے اونچا درجہ رکھتی تھیں جو یقیناً حضرت زید کو میسّر نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود محض اسلام کے قانون مساوات کے تحت جسمیں رنگ و نسل قومیت وقبائلیت اور گورے کالے کے فرق کے اعتبار نہیں کیا گیا۔ انہیں حضرت زید سے بیاہ دیا گیا۔ یہ پانچویں نعمت تھی جو آنحضرت کی طرف سے انہیں ملی کہ وہ سسرالی رشتہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقارب میں شامل ہوگئے اور ہاشمی خاندان کے داماد کہلائے۔ جو لے پالک کی لفظی نسبت سے کہیں زیادہ اونچی اور حقیقی نسبت تھی۔

(و) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جب انہیں اس نکاح کا پیغام بھیجا گیا تو وہ خود اسے حضور کا پیغام سمجھیں اور ہزار جان سے راضی ہوگئیں۔ لیکن بعد میں جب یہ معلوم ہوا کہ یہ پیغام زید بن حارثہ کے لیے ہے تو انھوں نے اس نکاح سے صاف انکار کردیا۔ مگر جب انہیں یہ مسئلہ

معلوم ہوا کہ خدا ورسول کے فیصلہ کے بعد کسی مومن مرد یا عورت کے لئے چون وچرا کا اختیار باقی نہیں رہتا تو باوجود خلاف مزاج ہونے کے محض اللہ ورسول کی خوشنودی کی خاطر اس نکاح پر راضی ہوگئیں۔ بہرحال اس جوڑا جوڑنے کی سعادت حضرت زید کو آنحضرت ہی کی طرف سے ملی۔ جو اُن پر انعام مزید تھا۔

(۱) پھر بعض رسوم جاہلیت توڑنے کیلئے اگر ان میں سے بعض انعاموں میں تبدیلی بھی ہوئی تو بتبادلہ میں انھیں بعض وہ انعامات عطا ہوئے جو ان سارے مذکورہ انعاموں سے بدرجہا بالاتر اور بڑھ چڑھ کر تھے جس کی تفصیل یہ ہے کہ اُس دور جاہلیت کی رسوم میں ایک جاہلانہ رسوم یہ تھی کہ کسی کو متبنٰی بنا کر یہ عقیدہ باندھ لیا جاتا تھا کہ لے پالک کو زبان سے بیٹا کہتے ہی وہ حقیقی بیٹے کے درجہ کو پہونچ جاتا ہے اور اسپر سارے احکام وہی جاری ہوجاتے ہیں جو حقیقی بیٹے کے ہوتے ہیں اس رسم کو توڑنے اور لے پالک کی اختیاری اور عارضی نسبت کے بنائے ہوئے بیٹے کو حقیقی بیٹے سے جدا کرنے بالفاظ دیگر اس لفظی اور محض اخلاقی تعلق پر بیٹا کا لفظ بولنے سے حقیقی بیٹے کے بارہ میں جو التباس اور اشتباہ واقع ہوتا تھا اسے زائل کرنے کے لئے جب قرآن کریم نے حکم دیا کہ

اُدعوھم لآبائھم ھو اقسط عند اللہ فان لم تعلموا اٰبائھم فاخوانکم

(ان لے پالکوں کو انہیں کے اصلی باپوں کیطرف نسبت دیکر پکارو دینی مونھ بولے باپوں کی نسبت سے مت پکارو) کہ یہی

فی الدین و موالیکم اللہ کے نزدیک عدل وانصاف کی بات ہے اور اگر تم ان کے اصلی باپوں کو جانتے نہ ہو تو یہ (لے پالک، تمھارے دینی بھائی اور موالی ہیں (اس لیے اسی نسبت سے انھیں پکارا کرو بہر حال منھ بولے باپ کے نام سے انہیں مت پکارو جس سے لوگ انھیں اس منھ بولے باپ کی واقعی اولاد سمجھنے لگیں اور اس کی حقیقی اولاد اور اس موھنہ بولی اولاد میں التباس اور اشتباہ واقع ہونے لگے)

اس حکم خداوندی کے نازل ہونے پر حضرت زید کو زید ابن محمدؐ پکارنا یک لخت ترک ہو گیا اور لوگ اس سے بچنے لگے حتیٰ کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علانیہ یہ ارشاد فرمایا کہ

انت اخونا و مولانا اب تم ہمارے دینی بھائی اور موالی ہو (یعنی ہم تمھارے دلی ہیں باپ نہیں ھیں)

چنانچہ وہ اپنے حقیقی باپ ہی کی طرف نسبت کر کے زید بن حارثہ پکارے جانے لگے۔ ظاہر ہے کہ زید بن محمد کی اعلیٰ ترین اور باافتخار نسبت کا ملنے کے بعد اچانک چھن جانا خواہ وہ لفظی ہی تھی حضرت زید کیلئے کس درجہ دل گیری اور دل گرفتگی کا باعث ہوا ہو گا۔

ادھر حضرت زید اور حضرت زینب کے مزاجوں میں غیر معمولی تفاوت اور ناموافقت کی وجہ سے جب کہ حضرت زید نے حضرت زینب کو طلاق دیدی (جس کی تفصیل آگے آتی ہے) تو حضور اکرمؐ اور آپ کے خاندان سے وہ سسرالی رشتہ کی قرابت بھی ختم ہو گئی جو اس نکاح سے قائم ہوئی تھی تو حضرت زید کے لئے آزردگی پر آزردگی

کے اسباب مہیّا ہو گئے جس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا رسمی ابنیت
اور حقیقی دامادی گویا نسبی اور صہری دونوں ہی نسبتوں کی نعمتیں جو انہیں
اپنی الگ سے انہیں ملی تھیں یکلخت اُن سے منقطع ہو گئیں جو یقیناً اُنکے
لئے ایک عظیم حادثہ اور ابتلا رتھا تو حق تعالیٰ نے اس سلب نعمت پر
انہیں ایک ایسی عظیم اور امتیازی نعمت بخشی جو صحابہ کرام کے بھرے مجمع
میں سے کسی کو بھی میسّر نہ آئی اور وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے اس نکاح زینب
کے سلسلہ سے سارے ہی صحابہ میں سے صرف ان ہی کا نام قرآن
کریم میں ذکر کرنے کے لئے منتخب فرمایا اور فلمّا قضٰی زیدٌ فرما کر
ان کے نام کو ذکر دوام اور عزت دوام کی نعمت عطا فرمائی۔ گویا اگر
اُن سے ایک وقتی اور ہنگامی شرف (نکاح کا دامادی رشتہ) جدا ہو گیا
جس کا جدا ہو جانا ہر وقت ممکن تھا جبکہ وہ اختیاری تھا تو اس کی
جگہ حق تعالیٰ نے ایک دائمی اور ابدی شرف بخشا جس کا جدا ہو جانا
ناممکن ہے جب کہ سارے جہانوں میں سے کسی کے بھی اختیار کی بات
نہیں اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں ان کا نام صراحت کیساتھ ذکر فرمایا گیا
کیوں کہ قرآن کریم نہ صرف قیامت تک ہی باقی رہیگا بلکہ بنص حدیث
قیامت کے بعد آخرت میں بھی ابدالآباد تک قائم رہے گا اور جنتوں میں
پڑھا بھی جاتا رہیگا اور نہ صرف پڑھا ہی جائے گا بلکہ اس کی تلاوت
پر درجات جنت کی ترقیاں بھی ملتی رہیں گی۔ اس لئے حضرت زید کا واقعہ
اور ان کے نام کیساتھ ان کا ذکر بھی فلمّا قضٰی زیدٌ منھا وطرًا کی آیت

میں ابد الآباد تک قائم اور بطور وردِ وظیفہ ہر متنفّس کے زبان پر زد رہے گا جس کی تلاوت کیجاتی رہے گی نیز اس نام کے ہر حرف پر وہی اجر و ثواب دیا جاتا رہے گا جو قرآن کی تلاوت پر فی حرف پر دس نیکیاں ملنے کا ضابطہ خود قرآن نے مقرر کر دیا ہے پس اگر زید بن محمد یا ہاشمی دامادی کی نسبت اُن سے بمصلحت لیلی گئی جس کا لے لیا جانا انسانوں کا اختیاری فعل تھا اور ہر وقت ممکن تھا تو کلام خداوندی میں اُن کا نام ذکر کئے جانے اور اسے مخلوق کا وردِ وظیفہ بنا کر موجب اجر و ثواب بنا دی جانے کی نسبت انہیں دی گئی جو اس سلب شدہ انعام سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر عظیم ابدی اور نسبت خداوندی ہے جسے نہ کوئی مٹا سکتا ہے نہ سلب کر سکتا ہے۔

غرض حضرت زید کو اولاً اسلام کی نعمت ملی جو نعمتوں کا سرچشمہ تھی پھر حضور اکرم کے غلام کہلانے کی نعمت ملی پھر حریّت و آزادی کی نعمت ملی جو من اللہ تھی پھر نبی کے لے پالک ہونے کی نسبت ملی جو خود ایک نعمت تھی پھر قرابت نبوی کی نعمت ملی جو من جانب الرسول تھی اور آخر کار بعض نعمتوں کے تبادلہ میں حق تعالیٰ کی طرف سے قرآن حکیم میں ان کا نام آنے اور اس کے دائمی ذکر و تلاوت اور اس پر تلاوت کنندوں کے اجر و ثواب کے مرتب ہونے رہنے کی عظیم و جلیل نعمت ملی۔ جس سے وہ جہانوں میں دوامی طور پر محبوب القلوب اور محبوب الذکر بن گئے۔ یہی وہ چند در چند انعاماتِ خداوندی اور انعاماتِ نبوی

کی مفصل تاریخ اور حضرت زید کے مفاخر و مناقب اور فضائل کی مرتب سوانح ہے جس کی طرف قرآن حکیم نے اپنے معجزانہ اور بلیغ انداز میں اشارہ فرمایا۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ

اور (اے رسول) جب آپ کہنے لگے اس شخص (زید بن حارثہ) کو جس پر اللہ نے انعام کیا اور خود آپ نے بھی انعام کیا۔

اِن انعاموں کی تاریخ کا اہم ترین جزو بھی نکاح زینب ہے جو حضرت زید سے کیا گیا۔ کیوں کہ معاندین کے اتہامات اور شبہات و وساوس کی آماجگاہ بھی یہی جزو بن سکتا تھا اس لیے قرآن نے اولاً اجمالی اور کلی انداز سے بطور تمہید واقعہ اس نکاح کی طرف اشارہ فرمایا کہ "اے رسول جب آپ کہنے لگے اس شخص کو جس پر آپ نے انعام کیا" اور اس انعام میں یہ نکاح شامل ہے تو اصولی انداز میں نکاح کا ذکر آگیا۔ پھر اس کے بعد متصلاً خصوصی طور پر قرآن نے اس نکاح کی طرف ایک مستقل اشارہ فرمایا جس سے اس نکاح کا قرآنی ثبوت ہوا اور وہ یہ ہے کہ۔

اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ

(اے وہ شخص جس پر رسول نے انعام کیا) روکے رکھیے اپنے اوپر اپنی زوجہ کو۔

اولاً زوجیت یعنی جوڑا ہونے کا ذکر نکاح کا خصوصی ذکر ہے کہ بغیر نکاح کے زوجیت کا علاقہ ہی قائم نہیں ہو سکتا پھر زوجہ کو

اپنے اوپر پردے کے رکھنے اور طلاق دیکر جدا نہ کرنے کا حکم اس نکاح کے لئے دوسرا واضح اشارہ ہے کہ طلاق کی ممانعت منکوحہ ہی کے لئے کیجا سکتی ہے غیر منکوحہ محلّ طلاق ہی نہیں ہو سکتی کہ اس کے لئے امساک ۔ زوجہ کا حکم دیا جائے۔ پس ان دونوں اشاروں سے قرآن نے حضرت زید اور زینب کی زوجیت اور علاقۂ نکاح پر ثبوت کی ایک زبردست مہر لگا دی ۔جس سے صاف نمایاں ہے کہ مذکورہ سات انعاموں میں جنھیں مجمل اور کلی انداز میں قرآن نے ذکر کیا تھا یہ نکاح کا انعام اہم الاہم ہے کہ خصوصی طور پر اس کا ذکر واضح لفظوں میں کیا گیا تاکہ واضح ہو جائے کہ انعاموں کے اس تاریخی سلسلہ کے ذکر سے مقصود اصلی یہ نکاح ہی کا قصّہ ذکر کرنا ہے جسے بہت سے فاطر العقل ہدف ملامت بنانے والے تھے ۔ بہرحال اس تاریخی سلسلہ کی یہ پہلی کڑی۔ قرآن سے سامنے آگئی جسکو حسب وعدہ قرآنی اشارے کے تحت ہم نے احادیث و آثار سے مفصّل ذکر کر دیا۔

(۳) اس کے بعد کی صورت حال یہ ہوئی کہ یہ نکاح حضرت اقدس رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک پر ہو تو گیا مگر ادھر تو زینب کی خاندانی وجاہت اور نسبت کی بلندی حضرت زید سے کہیں زیادہ تھی' اور اُدھر حضرت زید اس کے برعکس جہاں نسبت کے سلسلہ میں زینب سے گھٹے ہوئے تھے ۔ وہیں اُن پر غلامی کی نسبت بھی لگ چکی تھی جو حریت و آزادی کے بعد بھی ذہنوں سے زائل ہونے

والی نہ تھی گو وہ فی الحال غلام نہ تھے مگر سابق غلام تو بہرحال کہلائے ہی جاتے تھے جسکی علامت خود یہ بعد کی آزادی بھی جو غلامی پر واقع ہوئی تھی اسلئے نفسیاتی طور پر حضرت زینب کی نگاہ میں اونچے نہیں ہو سکتے تھے اور اس لئے وہ انہیں موتھ نہ لگاتی تھیں بالخصوص جبکہ یہ نکاح بھی ابتدا ہی سے ان کی مرضی اور مزاج کے خلاف تھا اور محض آنحضرت کے ارشاد پر صرف آپ کی خوشنودی کیلئے ہو گیا تھا۔ مگر طبیعات کا عالم جداگانہ ہے جو اختیاری بھی نہیں ہے اور شرائع نے بھی اُسے کلیتہً پابند نہیں کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طبائع میں کوئی لگاؤ اور توافق قائم نہ ہونے سے روز روز کی لڑائی اور ناچاقی رہنے اور بڑھنے لگی۔ اور جب حضرت زید بیوی کی وجاہت، خاندانی عظمت، اور مزاج کے وقار و خودداری کی وجہ سے قابو نہ پاسکے تو شکایتیں لے لے کر آنحضرت کے پاس آنے لگے جن میں رخ طلاق دینے کی طرف تھا۔ مگر آپ انھیں ہر بار نصیحت فرماتے رہے کہ بیوی کو چھوڑنے کا ارادہ ہرگز مت کرو اور دیکھو زینب نے محض اللہ و رسول کی خوشنودی کی خاطر اپنے مزاج اور طبیعت کے خلاف یہ نکاح منظور کر لیا تھا۔ اس حالت میں اگر تم انھیں چھوڑ دو گے تو وہ اور اُن کے سارے اقارب اسمیں ذلت محسوس کریں گے۔ اسلئے طلاق کا ارادہ ہرگز نہ کرو۔ بلکہ صبر و تحمل سے کام لو اور نباہنے کی کوشش کرو۔ قرآن حکیم نے اپنے جامع انداز میں اس واقعہ کی حکایت کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا

کا خطاب حضرت زید کے بارہ میں نقل فرمایا کہ۔

امسك عليك زوجك — اپنی زوجہ (حضرت زینب) کو نکاح میں

واتق الله۔ — روکے رکھو (طلاق مت دو) اور اللہ سے ڈرو

(۳) لیکن باوجود ان شرعی اور عقلی نصائح کے مزاجوں کی طبعی ناموافقت بڑھتی ہی رہی اور جھگڑے پیش آتے رہے جس سے طلاق تقریباً یقینی ہوگئی تو اُس وقت من جانب اللہ آنحضرت کے قلب مبارک میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اگر زید نے تنگ آکر اور میری نصائح کے باوجود طبعی تقاضوں سے مجبور ہو کر جن پر انسان کا بس نہیں ہے واقعی زینب کو طلاق دے ہی دی تو اس میں زینب اور اُن کے اقارب کی توہین اور دل شکنی یقینی ہے جس کا ظاہری سبب اللہ کا رسول قرار پائے گا جبکہ یہ نکاح اللہ کے رسول ہی نے آگے ہو کر کرایا تھا تو اس صورت میں زینب اور اُن کے اقربار کی دلجوئی کی صورت اس کے سوا دوسری نہیں ہے کہ اس صورت میں خود زینب سے نکاح کر لوں تاکہ یہ دلشکنی اور توہین کا داغ اُن سے اور اُن کے خاندان سے مِٹ کر عزت افزائی کا تمغہ انھیں مل جائے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ جاہلیت کے جاہلوں اور منافقوں کی طرف سے یہ خطرہ ہے اور خوف بھی قلب مبارک میں لاحق ہوا کہ وہ اس نکاح کو برا عنوان دے کر کہیں یہ شہرت نہ دیں کہ اپنے لے پالک اور بعنوان جاہلیت حقیقی بیٹے کی جورو گھر میں ڈال لی۔ اور اپنی بہو سے نکاح کر لیا جو زمانہ جاہلیت کے رسم و رواج کے مطابق ناجائز اور بڑا شرمناک عیب شمار کیا جاتا تھا۔ گو دین فطرت

اور خدائی شریعت کی رو سے وہ ایک جائز فعل تھا جس میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہ تھا بلکہ اس مصلحت کے پیش نظر کہ اس سے جاہلیت کی ایک نامعقول رسم ٹوٹتی تھی عین مصلحت بھی تھا مگر بہر حال آنحضرت کے قلب مبارک میں اس دینی داعیہ (زینب و اقارب زینب کی توہین کے تدارک اور رسم شکنی) کے ساتھ عوام الناس اور جہلاء کی طرف سے یہ خوف برابر دامنگیر رہا کہ کہیں وہ اپنی ناسمجھی یا نفاق و عناد کی وجہ سے اس واقعہ کا غلط رنگ میں پروپیگنڈہ نہ کریں۔ اور اس سے سادہ لوحوں کے قلوب میں نبی کی طرف سے بدگمانی لاحق نہ ہو جو اُن کے ایمانوں کے لئے مہلک ثابت ہوں۔ حاصل یہ کہ آپ کے نفس کریمہ میں زینب کے نکاح کا خیال بھی آیا جو چھپا رہا اور جُہلا کی طرف سے غلط رنگ کے اتہامات کا خوف بھی لاحق ہوا جو قلب میں چھپا رہا اور آپ نے اس کا اظہار نہیں فرمایا۔

اخفاء واقعہ اور خوف عوام کی بھی وہ مستند اور آثار و روایات کی تاریخ ہے جس کی طرف قرآن حکیم نے اپنے معجزانہ انداز میں دو جملوں سے اشارہ فرمایا کہ۔

وتخفی فی نفسک۔ اور تم (اے پیغمبر زید کو طلاق سے روکتے وقت در صورت طلاق) چھپائے ہوئے تھے اپنے نفس میں (نکاح زینب کے خیال کو)

اور اس کے بعد فرمایا۔

وتخشی الناس۔ اور آپ ڈر رہے تھے لوگوں (کے غلط رنگ کے پروپیگنڈہ) سے بھی

اور اتہامات) سے (کہ اپنی بہو کو جورو بنا لیا)

بہر حال قرآن حکیم نے ان دونوں باتوں کی طرف اجمالی اور بلیغ اشارے فرما دیے اور احادیث و آثار نے اِن واقعات کی تفصیلات کو کھول دیا جس کا تذکرہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے

(۳) لیکن ادھر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جاہلوں اور معاندوں سے یہ خوف تھا اور ادھر حق تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ لے پالک کے بارہ میں عرب اور دوسری اقوام کے اس جاہلانہ خیال اور بیہودہ رواج کو کہ لے پالک کا لفظ آتے ہی وہ حقیقی بیٹا بن جاتا ہے اور اس کی متروکہ بیوی سے موُنھ بولے باپ کا نکاح جائز نہیں ہوتا اپنے نبی کے عمل کی ذریعہ منہدم کرائے جیسا کہ اس نے قانوناً بھی اُسے ختم فرما دیا تھا تاکہ آئندہ مسلمانوں کو اس مسئلہ میں کسی قسم کا خلجان لاحق نہ ہو اور پیغمبر کا عملی اسوہ سامنے آجانے کے بعد اس قانون کے کسی پہلو میں فطری اختلاف کرنے کی بھی گنجائش باقی نہ رہے تو حضرت زید کی مطلقہ بیوی سے نکاح کا جو خیال نبی کے دل میں مخفی تھا حق تعالیٰ نے نہ صرف اُسے اپنے قول اور قانون ہی سے کھول دیا بلکہ اپنے فعل سے اس کے اظہار اور وقوع کا سلسلہ بھی اس طرح شروع فرما دیا کہ اِدھر تو حضرت زید کے دل میں باوجود آنحضرت کی نصیحتوں کے خیال طلاق کو جما دیا اور اُدھر آنحضرت کے دل میں بصورت طلاق نکاح زینب کا داعیہ پیدا فرمایا پس اِدھر تو طلاق کا وقوع ہوا اور اُدھر آنحضرت کے لے پالک کی

مطلقہ سے نبیؐ پاک کا نکاح بصورت واقعہ ظاہر فرما دیا۔ جواب تک نبی کے قلب صافی میں بطور ایک خیال کے چھپا ہوا تھا تاکہ نبی کے فعل کے بعد کوئی بوالہوس اس نکاح کو عیب سمجھنے کی جرارت نہ کر سکے یہی وہ پردہ قلب کے مخفی امور اور اللہ کی طرف سے اُن کے کھولدئے جانے کی تاریخ ہے جس کی طرف قرآن حکیم نے اس ایک ہی مختصر اور معجزانہ جملہ سے اشارہ فرمایا کہ۔

ما اللہ مبدیہ (اے نبی جو تم اپنے نفس میں چھپائے تھے) اللہ اسے کھولنا چاہتا ہے۔

قرآن نے اس امر مخفی کو مجملاً ظاہر کیا اور اس کی صراحت نہیں کی کہ یہ امر مخفی کیا تھا؟ اور کیسا تھا؟ جسے اللہ نے کھولدیا۔ سو آثار و روایات نے اس اجمال کی تشریح اور تفصیل کرتے ہوئے بتلایا کہ یہ امر مخفی نکاحِ زینب کا خیال تھا اور اسیکو اللہ نے نہ صرف کھول ہی دیا بلکہ واقعہ بنادیا جیسا کہ واضح ہو چکا ہے۔ قرآن نے بھی اپنے بلیغ اشاروں سے اسی تاریخ کی تائید کی کیوں کہ وہ امر مخفی جس کا دعویٰ قرآن نے کیا کہ "نبی اپنے نفس میں کچھ چھپائے ہوئے تھے" اُسی چھپے ہوئے خیال کو اللہ نے کھولدینے کا دعویٰ کیا اور ظاہر ہے کہ کھل جانے والی چیز بھی نکاح زینب تھا جسے تسلیم کیا جاتا ہے تو خیال کی صورت سے چھپی ہوئی چیز بھی یہی نکاح زینب ہی ثابت ہوتا ہے اس لئے قرآن کے نظم سے پوشیدہ اور نمایاں چیز قرآن کی روسے بھی نکاح اور اس کا خیال ثابت ہوا۔ اب یہ کہ

یہ نکاح اور اس کا چھپایا ہوا خیال کیسا تھا؟ آیا معاذ اللہ عیب تھا جسے چھپایا جا رہا تھا جیسا کہ معاند دعویٰ کرتے ہیں یا صواب تھا جیسا کہ امر واقعہ ہے تو تاریخ نے اُسے ایک جائز اور مستحسن اقدام بتلایا بھی ہے جس کی تفصیل گذر چکی ہے قرآن کی رو سے بھی یہ دونوں باتیں پاک جائز اور مستحسن ہی ثابت ہوتی ہیں کیوں کہ قرآن کہتا ہے کہ اس کے چھپانے والے نبی برحق تھے (و تخفی فی نفسک) اور کھولنے والے خدائے برحق تھے۔ (ما اللہ مبدیہ) اور خدا اور رسول کی طرف کسی چیز کے کہنے اور کرنے کی نسبت ہو جانے کے معنی ہی اور اس کے برحق ہونیکے ہیں ورنہ اگر خدا ورسول بھی معاذ اللہ ناحق کہنے اور سننے لگیں تو پھر حق اور کہاں دستیاب ہو سکتا ہے۔ پس قرآن نے اس امر مخفی اور امر ظاہر شدہ کو خدا ورسول کی طرف منسوب کر کے اس کے پاک اور جائز ہونے کو واضح فرما دیا۔ اس لئے جہاں قرآنی اشارہ سے یہ ثابت ہوا تھا کہ یہ امر مخفی کیا تھا؟ یعنی خیال نکاح زینب تھا، جب کہ وہ قلب رسول کا پوشیدہ امر تھا یہ بھی قرآن ہی سے ثابت ہوا کہ وہ خیال کیسا تھا؟ یعنی مستحسن اور پاک تھا جب کہ وہ خدا کا کہا اور کیا ہوا تھا۔ اس لئے اس نکاح کے خیال اور وجود کو قرآن سے ثابت نہ شدہ کہکر اسے مجہول الحال یا نامعلوم الاحوال کہنا یا اس کے چھپانے کی کوشش کئے جانے کے سبب اُسے دل کا چور یا برا خیال سمجھنا محض نادانی اور نظم قرآن سے بے خبر ہونے کی دلیل ہے۔

سلسلہ کلام یہاں تک پہونچ جانے کے بعد حق تعالیٰ نے اپنے نبی کو مخاطب بناتے ہوئے آگے یہ فرمایا کہ اے رسول تم دل میں ایک بات چھپاکر مخلوق سے ڈر رہے تھے (جس کی حقیقت ابھی واضح ہوئی) حالاں کہ اللہ زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو اس سے معاندین نے اپنے دل کا مخفی غباریوں نکالنا شروع کیا کہ نبی معاذ اللہ خدا سے نہ ڈرے اور مخلوق سے ڈر گئے جو اسکی دلیل ہے کہ دل میں معاذ اللہ چور چھپا ہوا تھا اور لے پالک کی جورو کو اپنی جورو بنانے کا جذبہ دل میں آیا ہوا تھا لیکن قرآنی سلسلہ واقعات یہ ہے کہ ادھر تو اللہ کے رسول نے اس امر مخفی (خیال نکاح زینب) کو ظاہر کرنے میں جہلاء اور عوام الناس سے خوف اس لئے محسوس کیا کہ وہ رواج کی آڑ لے کر اسے برے عنوان سے شہرت نہ دیں اور رسول سے بدظنیاں پھیلاکر لوگوں پر ایمان کے دروازے بند کرتے نہ پھریں جس سے دین کی تبلیغ واشاعت رک جائے اور ادھر حق تعالیٰ کے نزدیک رسول خدا کی اس اجتہادی مصلحت کے مقابلہ میں جس میں غلط پروپیگنڈہ کا ڈر تھا یہ مصلحت زیادہ قابل توجہ تھی کہ اس نکاح کا جذبہ بجائے چھپائے رکھنے کے برملا نمایاں کر دینا چاہیے تھا تاکہ ایک امر شرعی (لے پالک کی بیوی سے مونھ بولے باپ کے نکاح کا جواز) ابتداء ہی میں کھل جاتا اور یہ امر جاہلیت کہ یہ نکاح ناجائز ہے یہ پہلے ہی مٹ جاتا گویا حق تعالیٰ کے نزدیک نبی پاک کے لئے زیبا یہ تھا کہ وہ اس خیال نکاح کو چھپانے کے بجائے برملا فرماتے کہ وہ امر جاہلیت توڑنے کے لئے اس نکاح کو ضروری اور دینی مصلحت جانتے ہیں

اور اسے ضرور انجام دیں گے تاکہ شریعت کا ایک اہم مسئلہ کھل کر نمایاں ہوجاتا اور رسم جاہلیت پر ہمیشہ کیلئے زد پڑ جاتی اب اگر اس انتشار خیالی سے کوئی بدظن ہو کر اور اس خیال کو خیال فاسد کہکر ایمان سے رہ بھی جاتا تو یہ کوئی اہم بات نہ تھی۔ نبی وقت پر نہ کبھی سب کے سب ایمان لائے نہ سب کے سب منکر ہوئے اسلام و کفر کی تقسیم دنیا میں پہلے بھی قائم رہی ہے اور آئندہ بھی باقی رہیگی اس لئے اس سے ڈر کر کسی دینی مہم کے خیال کو دل میں چھپائے رکھنا اور نہ کھولنا اہم مصلحت نہیں وقت کی اہم ضرورت اور مصلحت اگر تھی تو وہ جاہلیت شکنی اور لے پالک کی بیوی سے منھ بولے باپ کے نکاح کے عدم جواز کے تخیلات کو باادّل وحلہ ہی قوت سے توڑ ڈالنے کی تھی۔

حاصل یہ نکلا کہ نبی کا نبوّت کو بدظنی اور دین کو محدودیت سے بچانے کیلئے مخلوق سے خوف کھانا گو مبنی بر مصلحت اور معقول و مستحسن خوف تھا اور یقیناً یہ اغراض نفسانی پر مبنی خوف نہ تھا جو مذموم ہوتا ہے اور اس لیے یہ خوف بھی بوجہ اللہ ہونیکے سبب بالواسطہ خدا ہی کا خوف تھا لیکن اس موقعہ پر ضرورت اُس خوف کی تھی کہ جاہلیت کی ایک رسم کو پنپنے کا موقعہ نہ دیا جائے اور اسکی جگہ برملا رسم شرعی کو جاری کیا جلئے۔ پس حق تعالیٰ نے نبی کے اس بالواسطہ خوفِ خداوندی کی تائید نہیں فرمائی بلکہ اس بلا واسطہ خوف و خشیت الٰہی کو وقت کی مصلحت قرار دیا بالفاظ دیگر نبی کے اجتہادی خوف کی تصویب نہیں فرمائی بلکہ اس کی جگہ دوسرے خوف کی طرف صریحی الفاظ میں توجہ دلائی اسی حقیقت کی طرف قرآن نے اپنے ان

جامع الفاظ میں اشارہ فرمایا کہ :-

واللہ احق ان تخشاہ — اور اللہ زیادہ مستحق ہے کہ تو اس سے ڈرے

یہاں احق کا لفظ لاکر بتلایا گیا ہے کہ نبی کا وہ خوف جو انہیں لوگوں سے ایک مصلحت دینی کی خاطر تھا بلاشبہ حق تھا مگر احق یہ خوف تھا جس میں ان لوگوں کی رعایت کے بجائے صرف دینی مسئلہ کی ترویج کی رعایت کیجاتی جس سے واضح ہے کہ نبی کا لوگوں سے خوف کھانا بھی کوئی ناحق بات نہ تھی بلکہ بلاشبہ حق تھی جبکہ بمصلحت دین تھی لیکن اس سے زیادہ قوی حق کی بات یہ دوسرا خوف تھا جیسا کہ لفظ "اَحَق" اس کا شاہد ہے کیوں کہ قواعدِ عربیت کی رو سے "اَحَق" کا لفظ باطل کے مقابلہ میں نہیں بولا جاتا بلکہ حق کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے باطل کے مقابلہ میں حق آتا ہے نہ کہ "احق" جس کی وجہ یہ ہے کہ "اَحَق" فعل تفضیل ہے جس میں حق کی زیادتی پیش نظر ہوتی ہے نہ کہ جانب مقابل سے حق کی نفی۔ اور اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ زیادہ حق اور بہتر ہے۔ گو اسکی جانب مقابل بھی حق اور بہتر ہے۔ پس یہ افضل اور فاضل کا تقابل ہے نہ کہ فاضل و ناقص کا اندریں صورت کلام خداوندی وَاللہُ اَحَقُّ اَن تَخشَاہُ کا حاصل یہ نکلا کہ رسول اللہ نے دینی مصلحت کو سامنے رکھ کر مخلوق سے خوف کھایا تھا اور خیال نکاح کے اظہار سے بچے تھے وہ یقیناً حق تھا مگر زیادہ حق اور زیادہ بہتر اور افضل یعنی "اَحق" یہ تھا کہ اُس کا برملا اظہار کیا جائے جس سے واضح ہے کہ بلحاظ قواعد عربیت حق و صداقت ان دونوں خوفوں میں مشترک تھا فرق اگر تھا تو حَق اور اَحق

کا تھا جس سے صرف حق کے مراتب کا فرق ظاہر کرنا مقصود تھا کہ معاذ اللہ نبی کے کسی فعل کو ناحق یا ناجائز بتلانا کہ نبوت کے بعد یہ صورت ناممکن ہے۔ پس یہ حق و باطل کی بحث نہیں کہ نبی کے خوف کو معاذ اللہ باطل کہکر معاندین کو اظہار عناد کا موقعہ ملے بلکہ اجتہادی خطاٴ و صواب کی بحث ہے کہ جس میں ایک جانب حق حقیقی ہوتا ہے اور ایک جانب حق اضافی اور دونوں پر اللہ کی طرف سے اجر و ثواب کا وعدہ دیا گیا ہے جو ناجائز یا باطل پر کبھی نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے یہاں باطل یا ناحق کا کوئی سوال نہیں۔ پس معاندین کا اس تخش الناس (تو لوگوں سے ڈرتا تھا) کے لفظ سے اس خوف کے ناحق ہونے پر استدلال کرنا اور وہ بھی قرآن کی سر رکھ کر قرآن پر ہی نہیں عربی لغت پر بھی کھلی افترا پردازی ہے اور ساتھ ہی ایک واقعہ کی صحیح تاریخ کو اپنے تخیلات کی آمیزش سے مسخ کرنے کی نامبارک سعی ہے جو کھلی تاریخ خیانت بھی ہے

(۵) بہر حال اِن مراحل کے بعد جب یہ واضح ہو گیا کہ نکاح زینب کا خیال معاذ اللہ کوئی جرم یا برا خیال نہ تھا بلکہ ایک جائز نکاح کی خواہش تھی اور بمصلحت دین تھی البتہ اس میں بے پالک کا بیچ آجانے کی وجہ سے صرف جاہلوں اور منافقوں سے غلط پروپیگنڈہ کا خطرہ قلب نبوت میں لاحق ہوا تو حق تعالیٰ نے اُسے بھی صاف فرما دیا کہ اللہ اس نکاح کی تائید میں ہے اور اس درجہ کہ اُس کے چھپانے کو بھی اُس نے پسند نہیں فرمایا چہ جائیکہ اصل نکاح کو ناپسند فرماتے اور اگر نبی نے اُسے

اپنی اجتہادی مصالح کی بنا پر نہیں کھولا تو اللہ خود اُسے کھولدینے والا
چنانچہ اُس نے اُسے برملا کھولتے ہوئے اپنے رسول کو خود مطلع فرمادیا کہ
زینب کو آپ کے نکاح میں دینے والے ہیں جب وہ زید سے آزاد ہو
اور اس مصلحت سے دینے والے ہیں کہ جاہلیت کے اس بے بنیاد خیال
اور بے حقیقت رسم ورواج کی جڑ کٹ جائے کہ موٗنھ بولا بیٹا موٗنھ
بولتے ہی اصل بیٹا بن جاتا ہے اور زبان سے کہنے والا اس کا اصل
باپ ہو جاتا ہے اور اس کی بیوی موٗنھ بولے باپ پر حقیقی بہو بن کر
ہو جاتی ہے چنانچہ قرآن نے اس حقیقت کا اعلان اِن الفاظ میں کی

فلما قضیٰ زید منها وطرا
زوجنٰکها لکیلا یکون علی
المؤمنین حرج فی ازواج
ادعیاءهم اذا قضوا منهن
وطرا وکان امر اللہ مفعولا

پھر جب زید تمام کرچکا اس عورت د
سے اپنی غرض ہم نے اسکو تیرے نکاح م
دیدیا تاکہ نہ رہے مسلمانوں پر گناہ نکا
کرلینا اپنے لے پالکوں کی بیویوں سے جب
وہ تمام کرلیں اُن سے اپنی غرض (یعنی گ

ان سے جماع بھی کرلیں جب بھی وہ ان موٗنھ بولے خسروں پر حرام نہ ہونگی کیونکہ یہ لوگ حقی
خسر ہی نہ تھے جبکہ لے پالکوں کے حقیقی باپ ہی نہ تھے، اور ہے اللہ کا حکم اٹل (یعنی ج
اس کے یہاں طے ہو چکی ہے وہ ہو کر رہیگی - پھر پیغمبر کو اس میں تامل کیوں ہو

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت زینب کا آنحضرت سے یہ نکا
براہ راست خود مقصود نہ تھا ورنہ آپ کے پاس ازواج مطہرات اور بھی
بلکہ مقصد حقیقی جاہلیت کے اس رسم کو عملاً توڑنا تھا کہ لے پالک کی بیو

حقیقی بہو بن کر لے پالک کے مونھ بولے باپ پر حرام ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ غیر معقول اور بے حقیقت مروجہ رسم ان دو نکاحوں کے بغیر نہیں ٹوٹ سکتی تھی کہ اولاً حضرت زینب کا نکاح حضرت زید سے ہو جو حضورؐ کے لے پالک تھے اور پھر دوبارہ آنحضرت سے ہو جو حضرت زینب کے مونھ بولے خسر اور حضرت زید کے مونھ بولے باپ تھے کیونکہ مقصود اصلی خود یہ نکاح نہ تھا بلکہ زینب کو آپ کے لے پالک کے نکاح میں لاکر پھر ان کی متروکہ بیوی کی حیثیت سے انہیں حضور کے نکاح میں لانا تھا تاکہ لے پالک کی متروکہ بیوی اور بالفاظ جاہلیت (فرضی) دو بیٹے کی بہو سے جواز نکاح کا قانون عملاً نافذ ہو اور پیغمبر کے اسوہ حسنہ کے راستہ سے دنیا کے سامنے آجائے جسمیں کسی ادنیٰ خلجان یا تردد کی گنجائش باقی نہ رہے کیوں کہ پیغمبر کے کہے ہوئے میں تو تاویلات کر لیا جانا ممکن ہے مگر کئے ہوئے عمل میں تاویلات کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی اور جب یہ صورت تھی تو قدرتی طور پر آنحضرت کے قلب مبارک میں دو ہی جذبے اور داعیے بھی آنے چاہئیں تھے اولاً زینب کے نکاح کا جذبہ حضرت زید کی اور ثانیاً اپنے نکاح کا جذبہ زینب سے۔ سو پہلے جذبہ کے تحت تو زید و زینب کے نکاح کا آپ کو اہتمام تھا کہ زینب نے اگر خود بھی اپنا نکاح حضور سے چاہا تو بھی قبول نہ کیا گیا اور زید سے ان کے نکاح کے بارے میں یہ اعتنا و توجہ کہ زینب اور اُن کے اقارب نے نہ چاہا تب بھی یہ نکاح ضرور ہوا اور اتنی اہمیت کے ساتھ کہ زید اور زینب میں ناموافقت بھی ہو تب بھی نکاح

نافذ العمل ہوجتی کہ زید اگر زینب کو طلاق بھی دینا چاہیں تو تب بھی آپ
اتق اللہ (خدا سے ڈرو) فرما کر انہیں بیوی کو روکے رکھنے اور طلاق
سے باز رہنے کی ہدایت فرمائیں مگر اس کے بعد دوسرا جذبہ یہ کہ اگر ز
پر طلاق ہوجائے تو پھر ان کا نکاح خود آنحضرت ہی اپنے سے فرمائیں
اور اس کا اتنا اہتمام کہ فرمودہ حق کے بعد خواہ دنیا کچھ بھی کہے اور جا
والے کتنا بھی مخالف پروپیگنڈہ کریں مگر یہ نکاح ضرور ہو۔ ظاہر ہے
ان دونوں جذبوں کے بغیر یہ دونوں نکاح وجود پذیر نہیں ہوسکتے
اور ان دونوں نکاحوں کے ہوئے بغیر یہ خداوندی مصلحت عم
نمایاں نہیں ہوسکتی تھی کہ لے پالک کی بیوی سے شرعاً نکاح درست
اور بلا تردد جائز ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت زینب باوجودیکہ پہلے ہی سے حسین و جم
بھی تھیں اور باوجاہت بھی مگر اُن کے پہلے نکاح کے وقت نہ آنحض
کے قلب و مبارک میں اس حسن و جمال کی طرف کوئی میلان ہوا نہ ا
التفات بلکہ دوسرے سے نکاح کر کے انہیں اپنے اوپر حرام کر لیے
رہا مگر وہی حضرت زینب جب کہ طلاق کے مرحلوں سے گذرنے لگ
اور طلاق یقینی ہوتی گئی تو اس وقت آنحضرت کی نگاہ جب ان پر پڑ
تو اب ان کا چہرہ جاذب توجہ بھی نظر آیا اور میلان قلب بھی پیدا ہو گ
جسے آنحضرت نے بھی حیرت و تعجب کے ساتھ بیساختہ فرمایا (جیسا
حدیث نبوی میں ہے)

سُبحانَ اللهِ مقلِّبِ القلوب پاک ہے اللہ (خود بھی اور اس کے افعال بھی)
ہر تہمت اور ہر عیب سے جو دلوں کو (دم کے دم میں) پلٹ دینے والا ہے
(کہ کل تک زینب کے جمال میں کوئی کشش نہ تھی جب کہ انہیں تکوینی طور
پر حضرت زید کی بیوی بننا تھا اور آج اُن میں یہ کشش پیدا ہو گئی جب کہ
ان کا مطلقہ ہونا یقینی ہو گیا اور بمصلحت دینی زوجہ رسول ہونا تکوینی
طور پر مناسب وقت بن گیا۔

چنانچہ حیرت و تعجب تو لفظ "سبحان" سے ظاہر ہے جو تعجب کے لئے
استعمال کیا جاتا ہے۔ قلبی رخ کی تبدیلی تقلیب قلوب کے کلمہ سے نمایاں
ہے جس کے معنیٰ دلوں کے پلٹ دینے کے ہیں اور اس کا منجانب اللہ
ہونا مقلب القلوب کے کلمہ سے نمایاں ہے ظاہر ہے کہ ان دونوں
قسم کے دو داعیوں۔ اور دونوں قسم کے دو جذبوں کے بغیر جاہلیت
کے اس رسم ورواج کا ٹوٹنا ناممکن تھا۔ جو صدیوں سے دلوں میں
جما ہوا چلا آرہا تھا اس لئے حضرت زینب کے یہ دو نکاح ان دونوں
جذبوں کے تحت آنحضرت ہی کے عمل سے کر لئے گئے اور اپنے اپنے
وقت میں ان کے داعیے اور جذبے آپ ہی کے قلب صافی میں پیدا
فرما دیئے گئے۔ جس سے صاف نمایاں ہے کہ قلب نبوی کے رخ کی یہ تبدیلی
اُسی خداوندی مصلحت کے تحت تھی جس کی تعمیل اور تکمیل کے لئے
انبیاء کے قلوب ہمیشہ مستعد اور آمادہ رہتے ہیں۔ قرآن نے آیت
بالا میں ان ہی دو جذبوں پر روشنی ڈالی ہے قضی زیدؓ سے ایک

جذبہ واضح ہے اور "ٹھنگھا" سے دوسرا جذبہ نمایاں ہے اور لکیلا یکون سے ان دونوں جذبوں کی پاکیزہ غرض وغایت (یعنی لے پالک کے بارے میں رسم جاہلیت کا مٹانا اور رسم اسلامیت کو ابھارنا) واضح کی گئی۔

۷ اور آخر کار قرآن حکیم نے اس جزی واقعہ کی اہمیت کی پوری تاریخ پر بلیغ اشاروں سے روشنی ڈالتے ہوئے اسی آیت کے آخر میں اس کی اصولی بنیادوں کو بھی خود ہی کھولدیا اور اعلان کیا کہ لوگ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زید بن حارثہ کے حق میں حقیقی باپ تصور کرنے کی فکر میں ہیں اور حقیقت واقعہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم مردوں میں سے کسی کے بھی باپ نہیں۔

ماکان محمد ابا احد من	محمد صلی اللہ علیہ وسلم باپ نہیں ہیں کسی کے
رجالکم ولکن رسول اللہ	تم مردوں میں سے لیکن رسول ہیں اللہ کے
وخاتم النبیین وکان اللہ	(اس لئے انہیں ساری امت کا روحانی
بکل شئی علیما ۔	باپ کہا جا سکتا ہے) اور مہر ہیں سب
(الاحزاب)	نبیوں پر (کیونکہ وہ آخری نبی ہیں اور

مہر آخر ہی میں لگا کرتی ہے جس کے بعد نہ کوئی مضمون دستاویز میں گھٹ سکتا ہے نہ بڑھ سکتا ہے اس لئے وہ خاتم النبیین اور آخر النبیین ہیں)

اگر انکے کوئی حقیقی بیٹا ہوتا تو آبائی کرامت اس کے نبی ہونے کی مقتضی ہوتی اور اس سے ختم نبوت باطل ہو جاتی اس لئے اللہ نے

بوجہ خاتم النبیین ہونے کے انھیں مردوں میں سے کسی کا باپ ہی نہیں بنایا تاکہ ختم نبوت میں کوئی خلل نہ پڑے۔ تو اس اصول پر بھی وہ زید بن حارثہ کے باپ نہیں ہو سکتے کہ تم زید کی متروکہ بیوی سے ان کے نکاح کو بیٹے کی بہو سے نکاح کا طعنہ دیکر مجروح قرار دینے لگو) اور ہے اللہ اُن سب چیزوں کا جاننے والا (اس کے علم کو چھوڑ کر تم جو کچھ بھی کہو گے وہ رسوم جہالت کی بات ہوگی جو قابل سماعت نہ ہوگی)

جس سے واضح ہے کہ زید بن حارثہ کا آنحضرت کا بیٹا ہونا جیسے واقعہ کے خلاف ہے ویسے ہی ختم نبوت کا بھی منافی ہے اس لئے انکی مطلقہ بیوی سے آنحضرت کا نکاح کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہو سکتی۔

پھر اسی کی ساتھ قرآن حکیم نے اس واقعہ کی خصوصیات سے الگ ہو کر مطلقاً لے پالک کے بارہ میں چند ایسی اصولی ہدایتیں بھی دیں کہ جن کی رو سے نمایاں ہوتا ہے کہ لے پالک حقیقی بیٹا بن ہی نہیں سکتا کہ اس پر حقیقی بیٹے کے احکام جاری کئے جانے لگیں اور اس سلسلہ میں دنیا کی اقوام میں جو غلطیاں اور غلط فہمیاں رائج تھیں اُن کا استیصال اصولی انداز سے بھی فرمایا تاکہ یہ بھی واضح ہو جائے کہ یہ حضرت زینب کے دو نکاحوں کا مسئلہ کوئی جزوی بات نہیں بلکہ تمدن و معاشرت کا ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے جس کے بارہ میں فکری اور عملی اصلاح ضروری تھی

(۸) مثلاً اول تو قرآن نے لے پالک کے بارہ میں اس کے بیٹے ہونے ہی کی نفی فرمائی اور خالق انسان کا مقولہ نقل فرمایا کہ ہم نے لے پالک کو

بیٹا بنایا ہی نہیں کہ تم اسے بیٹا پکارنے لگو اور پکارو گے تو یہ تمہاری زبان زوری اور محض زبانی افواہ کی بات ہو گی جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو گا فرمایا کہ۔

وماجعل ادعیاءکم ابناءکم ذالکم قولکم بافواھکم واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔ (الاحزاب)

اور نہیں کیا (خدا نے) تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے۔ یہ تمہاری افواہی بات ہے اور اللہ کہتا ہے ٹھیک بات اور وہی سجھاتا ہے راہ۔

(۹) دوسری ہدایت لے پالک کے لفظی اور محض اخلاقی تعلق کو نسبی اور صلبی بیٹے کے حقیقی تعلق سے جدا اور ممتاز رکھنے کے لیے یہ دی کہ لے پالک کو اُسی کے اصلی باپ کی طرف نسبت دے کر پکارنے کی تاکید کی اور منھ بولے باپ کی نسبت سے اُسے پکارنے کی ممانعت فرمائی۔ تاکہ اس لفظی اور فرضی بیٹے پر لوگوں کو حقیقی بیٹا ہونے کا شبہ نہ گذرے اور ان کی نگاہوں میں اولاد اور غیر اولاد باہم ملتبس اور مشتبہ نہ ہو جائیں جس سے جاہل لوگ ایک کے احکام دوسرے پر جاری کرنے کی جرات کرنے لگیں اور حدود احکام ضائع ہو جائیں۔ ارشاد فرمایا۔

ادعوھم لآبائھم ھو اقسط عند اللہ۔

ان (لے پالکوں) کو انہیں کے باپوں کی نسبت سے پکارو کہ یہی اللہ کے نزدیک عدل و انصاف ہے

چنانچہ اسی دن سے حضرت زید کو زید بن محمد کہکر پکارنا یک لخت ترک کر دیا گیا اور خود حضور نے بھی انہیں فرمایا کہ اب تم ہمارے دینی بھائی اور

مولیٰ یعنی آزاد کردہ غلام ہو جس کی ولایت ہمیں پہونچتی ہے ابن محمد نہیں ہو
(۱۰) ظاہر ہے کہ جب لے پالک پر بیٹے کی لفظی نسبت اور اس کے اصلی
باپ کے سوا موتھ بولے باپ کے انتساب سے پکارنا بھی ممنوع ٹھیرا دیا گیا
تو اس پر حقیقی بیٹے کے احکام تو کیا ہی جاری ہو سکتے تھے ؛ اس لئے قرآن
حکیم نے لے پالکوں کو حقیقی بیٹوں کے احکام سے خارج کرنے کے بارہ میں
ایک بنیادی اور اہم حکم یہ جاری فرمایا کہ لے پالک کی بیوی اگر مطلقہ
یا بیوہ ہو جائے تو وہ اپنے موتھ بولے خسر پر حرام نہیں ہو سکتی کیوں کہ نہ ؤ
اس کا حقیقی خسر ہے نہ یہ اس کی حقیقی بہو ہے جبکہ لے پالک نہ اس کا
حقیقی بیٹا ہے نہ یہ اس کا حقیقی باپ ہے چنانچہ قرآن کریم میں جہاں بیٹوں
کی بیویوں کو ان کے خسروں یعنی خاوندوں کی بابوں پر حرام ہونے کا حکم
فرمایا وہاں بیٹوں کی ساتھ من اصلابکم کی قید لگا دی جس کا حاصل
یہ ہے کہ جو بیٹے صُلبی اور نسبی ہوں انہیں کی بیویاں حرام ہوں گی یعنی جو صُلبی
اور نسبی نہ ہوں محض لفظی اور موتھ بولے ہوں اُن کی بیویاں ان باپوں پر
حرام نہیں ہیں کہ یہ بیٹے ہی نہیں کہ ان پر بیٹوں کے احکام جاری ہوں
ارشاد ربانی ہے۔

وحلائل ابنائکم الذین من اصلابکم :- اور حرام کیگئی ہیں تم پر بیویاں تمہارے بیٹوں کی جو تمہاری پشت سے ہوں (یعنی جو
پشت سے نہ ہوں بلکہ محض موتھ بولے ہوں جنہیں لے پالک کہا جاتا ہے وہ اس حرمت
میں حکم میں شامل نہیں کیوں کہ وہ بیٹے ہی نہیں ہیں۔

بہر حال من اصلہ بکو کی قید سے موُنھ بولے بیٹے یعنی لے پالک نکل گئے
اور کھل گیا کہ ان کی بیویاں موُنھ بولے باپ پر حرام نہیں ہیں کہ نہ وہ حقیقتاً
ان کے باپ ہیں اور نہ یہ حقیقتاً اُن کے بیٹے ہیں اور اس لئے نہ ہی یہ بیٹوں
کی بیویاں ان کی حقیقی بہوئیں ہیں اس لئے اُن پر حقیقی بہوؤں کے احکام
بھی جاری نہیں ہو سکتے۔

اس لئے الہامی دستورِ اساسی کے اور فطری قانون کے کھل جانیکے
بعد دنیا کی قوموں کا کوئی بھی رواج جو اس فطری قانون کے خلاف ہو لائق
التفات نہیں ہو سکتا۔ اُسے دیوار پر مار دیا جائیگا اور قانونِ حق ہی کو لامحالہ
قبول کیا جاوے گا۔ یعنی قانونِ الٰہی کو جو وحی ہونے کے ساتھ عقلی اور حسی
دلائل سے مدلل بھی ہے رواج کی بودی دلیل سے رد نہیں کیا جاویگا بلکہ قانون
سے اس رواج کو توڑ دیا جائے گا جو قانون حق کے خلاف ہو کہ یہی اُس
رواج کے غلط اور ناحق ہونے کی دلیل ہوگی کہ وہ قانون الٰہی کے خلاف
ہے لیکن جو لوگ خدائی شریعتوں کی نوعیت اور ان کے مقصد نزول اور
مزاج سے واقف نہیں کہ وہ آتی ہی ہیں دنیا سے غلط رواجوں کو مٹانے کے
لئے وہی اس کی جرارت کر سکتے ہیں کہ رواجوں سے شریعتوں کو توڑنے اور
مٹانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اور یہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو وقتاً فوقتاً
کمیٹیاں بٹھا بٹھا کر خدا کی کتاب میں ترمیم و تحریف کرنے اور رسوم و رواجات
کو سامنے رکھکر احکام خداوندی کو ان کے تابع بنانے سے نہ شرماتے
ہوں۔ حالانکہ رواج بندوں کا بنایا ہوا عملی دستور ہوتا ہے اور شریعت

خدا کا بنایا ہوا قانون۔ اگر خدا بندوں کے تابع نہیں ہو سکتا تو اس کا بنایا ہوا قانون بھی بندوں کے خود ساختہ دستوروں کے تابع نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے قرآن نے اصولی طور پر رواج کو جو انسانوں کی ہوائے نفس سے بنتا ہے اور قانون حق کو جو حکمت الٰہی سے چلتا ہے جدا جدا کر کے اپنے رسول کو امر کیا اس ہوائی رواج کو الٰہی قانون کے مقابلہ پر کبھی قبول نہ کریں جس کا سرچشمہ علم خداوندی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے

ولا تتبع اھواءھم بعد ما جاءک من الحق (القرآن)

اور ان (جہلا) کی خواہشات کی پیروی مت کر جبکہ حق تیرے پاس آگیا

ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون انھم لن یغنوا عنک من اللہ شیأا و ان الظلمین بعضھم اولیاء بعض واللہ ولی المتقین۔ (القرآن)

اور مت پیروی کر اُن (جاہل) لوگوں کی خواہشات نفسانی کی جو اصلیت کو جانتے ہی نہیں وہ اللہ سے ہٹ کر تیرا کچھ نہیں بنا سکیگا اور بلاشبہ ظالم بعض ان کے بعض کے مددگار رہیں اور اللہ والی ہے پارساؤں کا۔

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو ارشاد ہوا تھا جبکہ وہ فرعون کے مقابلہ پر روانہ ہو رہے تھے کہ۔

ولا تتبعان سبیل الذین لا یعلمون۔

آپ دونوں پیروی نہ کریں جاہلوں کی راہ (و رسم) کی۔

اِن آیتوں میں علم حق اور شریعت الٰہی کے مقابلہ میں جاہلوں کی راہ

چلنے کی ممانعت درحقیقت وہی قومی وطنی اور خاندانی رواجوں کی پیروی کی ممانعت ہے جو انسانی برادریوں میں غلط صحیح تصورات اور وقت کے آسودہ لوگوں کی خواہشات کے تحت قائم ہوجاتے ہیں اور ان بڑے لوگوں کی دیکھا دیکھی چھوٹے لوگ بھی اپنی عرفی حیثیت قائم رکھنے کیلئے ان کی کورانہ تقلید پر مجبور ہوجاتے ہیں جس سے یہ رواج پھیلتے پھیلتے چند دن کے بعد قومی اصول قرار پاجاتا ہے اور باوجود ان کی مضرتیں نمایاں ہوجانے کے ان رواجی بندھنوں اور سوسائٹی کی مجبوریوں میں جکڑے ہوئے لوگ اُن سے پیر باہر نہیں نکال سکتے۔ گو دل میں ان سے نفرت بھی رکھتے ہوں اور ان سے دل تنگ بھی ہوں۔

انبیاء علیہ السلام ہی اپنی روحانی قوتوں سے ان بندھنوں کو توڑ کر مخلوق کو ان کی مضرتوں اور مضرت انگیز پابندیوں سے آگاہ کرتے ہیں نجات دلاتے ہیں اور ان کے بعد ان کی چھوڑی ہوئی شریعتیں امت کے مقدس افراد کے ذریعہ ان غلط پابندیوں کے پھندوں سے خلق خدا کو نکالتی رہتی ہیں تاکہ دین حق ان ناحق رواجوں پر غالب رہے اور بندوں کے قانون کے بجائے دنیا میں خدا کا قانون چلے۔ ٹھیک اسی طرح لے پالک کے سلسلہ سے فرضی باپ بیٹے اور فرضی بہو کو حقیقی باپ بیٹے اور حقیقی بہو سمجھنے کا غلط تصور اور غلط رواج قوموں میں پھیل کر اصول اور قانون کی صورت اختیار کرچکا تھا۔ اسے اللہ کے رسول نے جہاں اصول و دلائل سے توڑ دیا ہیں اپنے اسوۂ حسنہ سے بھی اس کی جڑ بنیاد اکھاڑ

کر پھینک دی تاکہ یہ صدیوں کا بیٹھا ہوا تصوّر دماغوں سے نکل جائے اور یہ ہارا ستہ سامنے آجائے جس کا بغیر اسوۂ حسنہ کے سامنے آنا عادۃً محال تھا۔

یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مشرکین عرب کے دلوں میں نکاح بیوگان کی برائی حد درجہ جمی ہوئی تھی تو جہاں آپ نے اس بارہ میں قرآنی حکم سنایا کہ:۔

وانکحوا الایامی منکم   اور اپنے میں سے بیواؤں کا نکاح کیا کرو

وہیں اپنے عمل سے اسوہ یہ پیش فرمایا کہ جتنے بھی نکاح فرمائے سوائے ایک کے وہ سب بیواؤں سے ہی فرمائے جس سے دلوں میں سے اس نکاح بیوگان کی کھٹک نکل گئی اور مسلمان نکاح بیوگان کو عبادت سمجھکر کرنے لگے جس کے کرنے میں انہیں کوئی عار لاحق نہ رہا اور وہ صدیوں کا پڑا ہوا رواج اس عمل سے چند دنوں میں ختم ہو گیا۔ یا جیسا کہ مشرکین عرب میں بیٹی پیدا ہو جانا ایک بدترین عیب اور شرمناک بات سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے بیٹیوں کے پیدا ہونے پر انہیں زندہ درگور کر دینے کا عام رواج تھا۔ حق تعالیٰ نے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جہاں اس رواج کو قرآنی تعلیم اور شرعی اصول سے گری ہوئی بات سمجھا دی آپ کی زندگی کا تکوینی نقشہ یہ بنا دیا کہ آپ دنیا میں صرف بیٹیوں ہی کے باپ رہیں اور مردوں میں سے کسی ایک کے بھی باپ باقی نہ رہیں تاکہ بیٹی کا باپ ہونا عیب کے

کے بجائے انسان کا شرف قرار پا جائے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں آپ کے حق میں بیٹوں کے باپ ہونے کی نفی کو مقام فخر میں جگہ دی اور فرمایا کہ۔

ماکان محمدؐ ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین۔	نہیں ہیں محمدؐ تم مردوں میں سے کسی کے باپ دلیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں۔

حتیٰ کہ اگر حضرت زیدؓ کو لے پالک بنا لینے سے آپ کے نام مبارک کے ساتھ صرف ایک لفظی نسبت بیٹے کے باپ ہونے کی لگ بھی گئی تھی اور حضرت زیدؓ کو زید بن محمد پکارا جانے لگا تھا تو اسے بھی قطع کر دیا گیا تاکہ دنیا میں بیٹیوں کا باپ ہونا نہ صرف یہ کہ عیب نہ رہے بلکہ حضورؐ کے اس قدرتی نقشِ زندگی کی وجہ سے آپ صرف بیٹیوں کے باپ تھے اعلیٰ ترین شرف شمار ہونے لگے

بہرحال اسلامی قانون اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ زندگی نے لے پالک کی رواجی حیثیت ختم کر کے اس کی اصلی اور شرعی پوزیشن واضح کر دی کہ وہ محض ایک اخلاقی نسبت ہے نسب یا احکام نسب سے اس کا کوئی تعلق نہیں کیوں کہ یہ اخلاقی نسبت اختیاری چیز ہے اور نسب غیر اختیاری چیز ہے اور اختیاری کا غیر اختیاری بن جانا یا اسکے برعکس محال بات ہے جو محض فرض کر لینے سے واقعہ نہیں بن سکتا خواہ اسے رواج کے نام سے چلایا جائے یا رسوم کے نام پر ابھارا جائے وہ نفس الامر اور عقل و شرع پر حاکم نہیں ہو سکتی دین ہی اس رواج پر غالب

اور واجب الامتثال حکمراں رہیگا۔

واقعات مذکورہ کے قدرتی نتائج اور معترضوں کی کذب بیانی

یہ ہے واقعات کی تاریخی اور اصولی تفصیل جسے دس نمبروں میں ہمنے پیش کیا اور جس کی بنیادوں کی طرف تو قرآن کریم جامع اشارے کرتا گیا ہے اور ان کی تفصیلات کو احادیث نبوی اور آثار صحابہ یکجا کر دئے گئے ہیں جن کے مجموعہ سے ان واقعات کی مستند اور معتبر تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ اس مرتب اور قطعی سلسلۂ واقعات میں آپ نے کہاں کہاں اپنے ذہنی افسانے داخل کر کے اس صحیح تاریخ کو مسخ کرنے اور قرآن کے سر رکھ کر ان موہوموں کو قرآنی بیانات بتلانے کی نامبارک سعی کی؟ یقیناً اس کی قلعی ہمارے ان بیانات سے کھل چکی ہے تاہم تشخیص کیساتھ بھی میں چاہتا ہوں کہ ان واقعات مذکورہ کی روشنی میں آپ کے شبہات کا تجزیہ کر کے یہ ظاہر کردوں کہ ان وساوس کو قرآن کے سر تھوپ کر ظاہر کرنے میں کس قدر ابلہ فریبی اور دھوکہ دہی سے کام لیا گیا ہے اور جن امور کا ذکر تک قرآن میں نہیں ہے وہ کس جرأت کیساتھ اس کے سر منڈھ دئے گئے ہیں۔

(۱) آپ نے قرآن کا نام لیکر دعویٰ کیا ہے کہ معاذ اللہ رسولِ خدا نے ایک اچھے خاصے موزوں جوڑے (زید و زینب رضی اللہ عنہما) کو توڑ کر غیر موزوں جوڑا بنایا یعنی ان کا نکاح تڑوا کر زینب سے اپنا نکاح کر لیا حالانکہ زید ایک جوان تندرست خوبصورت اور تعلیم یافتہ آدمی تھے اور

اسکی بیوی (زینب) بھی جوان اور خوبصورت تھیں بخلاف اس کے محمد صاحب ایک نہایت ہی عمر رسیدہ انسان تھے الخ" بالفاظ دیگر زید و زینب پر ظلم کیا گیا سوال یہ ہے کہ قرآن کے کون سے لفظ سے آپنے یہ مضمون نکالا کہ رسول خدا نے یہ جوڑا تڑوا دیا اور معاذ اللہ زور و جبر سے کام لیکر اپنے نکاح کی تیاری کی؟ قرآن تو اگر کہہ رہا ہے تو یہ کہ یہ موزوں جوڑا جوڑنے والے ہی خدا و رسول تھے نہ کہ وہ اسے توڑنے والے تھے۔ کیا قرآن میں یہ صراحتاً موجود نہیں کہ خدا و رسول کی طرف سے حضرت زید پر عظیم عظیم انعامات کئے گئے جن میں کا ایک عظیم ترین انعام یہ نکاح بھی تھا جس کی طرف انعمت اور انعم اللہ سے قرآن نے اجمالی اشارہ فرمایا اور احادیث و آثار یعنی بیان قرآن نے اسکی تفصیلات واضح کیں۔ جیساکہ عرض کردہ واقعات کی دفعہ ۱ کے ضمن (د) میں بردوئے بیانات قرآنی یہ ساری تفصیل گذر چکی ہے۔

اب آپ ہی بتلائیں کہ نکاح کا انعام موزوں جوڑا جوڑنے کے لئے کیا جاتا ہے یا آپ کی اصطلاح کے مطابق جوڑا توڑنے کے لئے؟ پھر بنص حدیث خدا کے رسول ہی نے تو زینب کے پاس حضرت زید کے نکاح کا پیغام بھیجا تھا اور باوجود ان کے خلاف مرضی ہونیکے بحکم خدا و رسول ہی یہ نکاح عمل میں لایا گیا تو کیا پیغام نکاح دنیا میں جوڑا جوڑنے کیلئے بھیجا جاتا ہے یا جوڑا توڑنے کیلئے۔ اور کیا یہ جبر زید و زینب پر نکاح توڑنے کے لئے کیا گیا تھا یا نکاح جوڑنیکیلئے

پھر حضرت زید کو بار بار طلاق کے ارادہ سے روک کر حضرت زینب کو نکاح میں روکے رکھنے کا حکم جو رسول دے رہے تھے جسے قرآن نے امسک علیک زوجک میں بیان کیا ہے کیا جوڑا توڑنے کی یہ سعی تھی یا جوڑے کا جوڑ باقی رکھنے کی جدوجہد تھی ؟

بہرحال قرآن کا بیان تو یہ ہے کہ زید و زینب کو رسولِ خدا ہی نے نکاح سے جوڑا اور آپ کہہ رہے ہیں کہ توڑا قرآن کہہ رہا ہے کہ اس نکاح کے جوڑنے کو رسول نے باقی رکھا آپ کہہ رہے ہیں کہ جوڑنے کو ختم کر دیا قرآن تو کہہ رہا ہے کہ اس جوڑے کو جوڑنے اور جڑا ہوا باقی رکھنے میں رسولِ خدا نے جبر سے کام لیا' اور آپ کہہ رہے ہیں کہ بروئے قرآن آنحضرت سے اس جوڑے کو توڑنے میں جبر سے کام لیا۔ غلط بیانی کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے پر کا کبوتر تو بنایا جا سکتا ہے مگر بے پر کی اڑا دینا حقیقتاً انتہائی دلیری کا کام ہے کہ جھوٹ اپنا ہو اور بیان کیا جائے دوسرے کے سر رکھکر' چہ دلاور است وزدے کہ بکف چراغ دارد'

(۲) آپ نے قرآن کے سر رکھکر فرمایا ہے کہ قرآن تو ایک عجیب چیز نظر آتی ہے جب اپنی بہو (بیٹے کی بیوی) یعنی حضرت زینب پر آنحضرت کی طبیعت مچل گئی تو پھر فوراً آسمانی وحی نے ساری روحانیت نیکی اور سچائی پر ایسا بھاری پردہ ڈالدیا کہ تمام دینداری چھپ گئی اور اپنے بیٹے کی جورو کو اپنی جورو بنانے کا حق اللہ میاں سے حاصل ہو گیا۔ سوال یہ ہے کیا

طبیعت مچل نے کی بھی صورت ہوتی ہے کہ جس پر طبیعت مچلی ہوا سے دوسرے کے نکاح میں دیکر اپنے اوپر حرام کر لیا جائے؟ کیا اس کی صورت یہی ہوتی ہے کہ زید کو طلاق سے روک کر اپنی طبیعت کے مچلنے کے تقاضوں کے دروازے کلیتہً اپنے اوپر بند کر دئے جائیں اگر طبیعت کے مچلنے کا یہ افسانہ کچھ بھی واقعیت لئے ہوئے ہوتا تو آنحضرت تو موقعہ کو غنیمت جانکر زید کو زیادہ سے زیادہ اس نکاح کو توڑ دینے اور طلاق دیدینے کی رائے دیتے بلکہ انہیں اسپر آمادہ فرماتے نہ یہ کہ انہیں خدا کا خوف دلا کر اس سے روکتے۔ نیز یہ کہ اگر بقول آپ کے طبیعت معاذ اللہ مچلی ہوئی تھی تو آنحضرت کو ابتداءً ہی حضرت زینب سے نکاح کر لینے میں کیا چیز مانع تھی جب کہ خود حضرت زینب ہی آنحضرت سے نکاح کرنے کی سوجان سے خواہشمند تھیں بلکہ انہوں نے ابتداءً اس نکاح کے پیغام کو قبول ہی یہ سمجھ کر کیا تھا کہ یہ آنحضرت کے نکاح کا پیغام ہے۔ پس کہاں طبیعت کا مچلنا اور کہاں اس کے بالکل مخالف سمت کے یہ اقدامات قرآن تو اشارے یہ کر رہا ہے کہ اس معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے آخر تک تمام طبعی تقاضوں سے بالاتر ہو کر محض وحی الٰہی اور منشاء خداوندی کی پیروی فرماتے رہے اور آپ ہیں کہ قرآن کا نام لیکر طبیعت کے مچل جانے کے افسانے گھڑ گھڑ کر دنیا کو مبتلائے فریب کرنے کی فکر فرما رہے ہیں اور وہ بھی اصل واقعہ کے بالکل مخالف سمت میں چلکر اور واقعات کے کلیتہً برعکس باور کرانے

کی سعی کے ساتھ حقیقتاً دن کو رات اور رات کو دن کہہ دینا آپ ہی کی ہمت مردانہ کا کام ہے ع جنوں کا نام خرد ہو خرد کا نام جنوں" ۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے" ۔ پھر جس حد تک حضرت زینب کی طرف آنحضرت کے اس جدید میلان قلب کا تعلق ہے جو طلاق زینب کے یقینی ہو جانے پر قلب مبارک میں پیدا ہوا تو اس کو احادیث میں خود آنحضرت ہی من جانب اللہ قلب کے بدل جانے سے تعبیر فرما رہے ہیں اور سبحان اللہ مقلب القلوب فرما کر اس تبدیلی کو طبعی نہیں بلکہ خداوندی تبدیلی ظاہر فرما رہے ہیں گویا اگر اس وقت بھی رجبکہ طلاق زینب یقینی ہو گئی تھی قلب مبارک زینب سے اسی درجہ الگ تھلگ رہتا جس درجہ وہ ابتداءً ایس نکاح زید کے وقت تھا تو زینب سے اس دوسرے نکاح کی صورت نہیں بن سکتی تھی اور ایسا ہوتا تو جاہلیت کی یہ رسم بد نہ ٹوٹ کر ۔ لے پالک کی بیوی سے موہنہ بولے خسر کا نکاح نہیں ہو سکتا ۔ جو اسوۂ حسنہ کا ایک بڑا زبردست خلا رہ جاتا ۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اپنی نبی کی طبیعت کو بدلا جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے سے یہ نکاح زینب خود آنحضرت کی طبیعت کا تقاضہ نہ تھا جیسا کہ سفہار نے باور کرانا چاہا ہے بلکہ خالص روحانی اقتضاء تھا جو من جانب اللہ ہوتا ہے جیسا کہ اس حدیث مذکورہ سبحان اللہ مقلب القلوب سے صاف نمایاں ہے کہ یہ تبدیلیٔ قلب مقلب القلوب کی جانب سے واقع ہوئی نفس کی طرف واقع نہیں ہوئی تھی لیکہ نبی کا نفس بھی پاک اور مطمئنہ ہوتا ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ روحانی

تقاضے بھی جب نمایاں ہونے کو آتے ہیں تو طبیعت کے راستہ سے نمایاں ہوتے ہیں اور ظہور کی شکل وہی ہوتی ہے جو اور انسانوں میں ہوتی ہے فرق اگر ہوتا ہے تو حقیقت اور منشا فعل میں ہوتا ہے کہ ایک کا طبعی فعل خواہش نفس سے ہوتا ہے اور ایک کا وہی فعل منشار حق سے لوگ ظاہر فعل کو دیکھکر حقیقت ناشناسی کے سبب انبیار کو بھی اپنے اوپر قیاس کرنے لگتے ہیں حالاں کہ منشار فعل میں زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق ہوتا ہے۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

غور کیا جائے تو اس نکاح کی طلب کو "طبیعت کے مچل جانے" سے تعبیر کرنا اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے جو علاوہ واقعات سے بے خبر ہونے کے مقام نبوت کی عظمت سے کلیتہً ناواقف ہو اور شاید کبھی بھی اسے کسی نبی پر ایمان لانے کی توفیق نصیب نہ ہوئی ہو۔ کیوں کہ نبوت پر ایمان لانے والا کبھی ایسے کلمات زبان پر نہیں لا سکتا جن سے کسی نبی کی طرف شہوت پرستی کا الزام یا اتہام بھی ہوتا ہو حتیٰ کہ اگر وہ اس شخصیت کو کسی وجہ سے نبی نہ بھی مانتا ہے تب بھی تیرہ صدیوں تک کروڑوں انسانوں کے مسلمہ مقتدائے اعظم کو ایسے ناشائستہ کلمات سے کوئی شریف الطبع انسان یاد نہیں کر سکتا کم سے کم اسلام نے تو اس کی کھلی ممانعت کی ہے اور نبی کی ادنیٰ توہین کو کفر قرار دیا ہے پھر اگر آپ کے مذہب کی بنیاد انکار و تکذیب ہی پر ہے تو آپ کو سمجھ لینا

چاہیئے کہ اسلام کی بنیاد اقرار عام اور تصدیق عمومی پر ہی ہے کہ یہاں حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت وعظمت اسی طرح واجب التسلیم اور عین ایمان ہے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ماننا اور عظمت کرنا اصل ایمان ہے کہ ان دونوں پیغمبروں اور ان کے سوا اور بقیہ سارے ہی پیغمبروں کی تصدیق کئے بغیر آدمی مسلمان نہیں ہو سکتا - اور ان میں سے کسی کی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ توہین سے اس کا اسلام وایمان باقی نہیں رہ سکتا جیسا کہ اس بارہ میں قرآن کریم کا کھلا اعلان سورہ بقرہ کے پندرہویں رکوع میں موجود ہے کہ ہم ایمان لانے کے سلسلہ میں رسولوں میں تفریق نہیں کر سکتے بلا استثنا سارے ہی انبیاء پر نام بنام اگر نام لیا گیا ہے یا اجمالاً بلا نام اگر نام نہیں لیا گیا ہے ایمان لانا ضروری ہے ورنہ آدمی مومن نہیں ہو سکتا لیکن اس کے برعکس جن کے یہاں ایمان نام تکذیب اور نہ ماننے کا ہے -

آج کے عرف میں اسی کی نسبت پر حملہ" کہتے ہیں کہ جب کسی عمل میں اصول کی رو سے اعتراض کی گنجائش نہ ملے تو اپنی طبیعت کے اندر بھرے ہوئے غبار کو نکالنے کے لئے نیت اور دلوں کے مخفی رخ ہی کو آدمی نشانہ بنا لے جو انتہائی طور پر طبیعت کے عیب جو اور بدفطرت ہونیکی دلیل سمجھی گئی ہے (۲) آپنے قلب نبوی کے اس مذکورہ داعیہ کو جو دصورت طلاق زینب منجانب اللہ قلب پاک میں پیدا ہوا اور لوگوں کی خوف سے اسکے چھپائے رکھنے کو بہت اہم بنا کر پیش کیا ہے اور یہ باور کرانیکی کوشش کی کہ اگر یہ دعویٰ کوئی اچھا خیال ہوتا تو اسے

اُسے لوگوں کے خوف سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی لوگوں کے خوف سے چھپایا اسی چیز کو جاتا ہے جو دل کا چور ہوتی ہے اور اس کے کھل جانے میں بے عزتی کا خطرہ اور بھرم کھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اس پر مستزاد یہ کہ اس وسوسہ کو آپ نے قرآن کے سر رکھ کر پیش کیا ہے گویا قرآن کریم نے بھی نبی کے اس چھپے ہوئے خیال کو معاذ اللہ برا ہی باور کرایا ہے چنانچہ آپ اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں۔

پڑھئے سورۂ احزاب، خدا اپنے رسول سے فرماتا ہے۔

"تو چھپاتا تھا دل میں ایک بات۔ اللہ کرنا چاہتا ہے اسکو ظاہر تو ڈرتا تھا انسان سے، ڈرنا چاہیئے صرف اللہ سے"

آیت کے اس ترجمہ سے جو آپ ہی کا کیا ہوا ہے آپ نے خود ہی اپنی فصیح و بلیغ اور شائستہ عبارت میں "حسب ذیل نتیجہ نکالا ہے کہ

یہاں تک کی عبارت سے تو ایسا معلوم پڑتا ہے کہ متکلم خاطر کی کوئی ایسی بات بتانا چاہتا ہے جس کو ظاہر کرنے سے خاطر کو ڈر لگتا تھا لیکن حقیقت میں خاطر کے دل میں اس بات کو پوری کرنے کی لو لگی ہوتی ہے لیکن خوف اور ڈر کی وجہ سے اس بات کو عمل میں لانے کی ہمت نہیں پڑتی ہے ڈر ہے کہ کہیں لوگ اب تک کی کرائی ہوئی محنت پر پانی نہ پھیر دیں (آپ کا خط" بلفظہٖ)

آپ کی عبارت سے واضح ہے کہ آپ نے اس "چھپانے" "ڈرنے"

اور اللہ کے اسے کھولدینے" کے قرآنی مضامین سے اس امر مخفی (خیال نکاح زینب)، کو بحوالۂ قرآن شہوانی جذبہ اور معاذاللہ نبی کے دل کا چور قرار دیا اور اس لئے اسے "طبیعت مچل گئی" اور "خاطر کے دل میں لو لگی ہوئی تھی" وغیرہ سوقیانہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے اور اس کے ظاہر ہو جانے کے خوف کو افشاء عیب کا خوف قرار دیا چنانچہ کافی مہذب عنوان سے آپ نے اُسے ان بازاری الفاظ سے ظاہر فرمایا کہ "کہیں لوگ ابنک کی کری کرائی پر پانی نہ پھیر دیں" گویا عیب نہ کھل جائے اور خدا کے اظہار کو معاذاللہ نبی کے عیوب کو ظاہر کر دینا قرار دیا ہے گویا معاذاللہ پیغمبر تو اپنے عیب چھپانے کی فکر میں تھے تاکہ مخلوق میں جگ ہنسائی نہ ہو اور خدا اپنے پیغمبر کے معاذاللہ عیب کھولنے کی فکر میں تھا کہ کسی نہ کسی طرح جگ ہنسائی ہو جائے۔ پھر یہ کمال کیا گیا کہ ان ساری خرافات کو قرآن کے سر رکھکر کہا گیا ہے گویا قرآن بھی اِن شیطانی وسوسوں میں آپ کا مؤید ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ نقلِ کفر کفر نہ باشد۔

سوال یہ ہے کہ قرآن کے کون سے کلمہ سے آپ نے یہ مطلب نکالا کہ نبی کے دل میں جو بات چھپی ہوئی تھی وہ عیب کی بات تھی؟ اور نبی کا اس چھپی ہوئی بات کے اظہار سے ڈرنا اس امر مخفی کے گناہ یا عیب ہونیکی وجہ سے تھا، اس موقعہ پر تو میں وہی کہوں گا جو آپنے لے پالک کی بیوی سے نکاح کے جواز کے بارہ میں انجیل کا نام لیکر فرمایا تھا کہ کیا خدا اپنی دی ہوئی شریعت (یعنی آدمی کی بیوی کا لالچ نہ کرنا) کو

اس طرح کی شریعت (یعنی لے پالک کی بیوی سے موتھ بولے خسر کا نکاح کر لینا) سے باطل کر سکتا ہے حالانکہ شریعت اس سے پاک ہوتی ہے کہ اس میں تضاد بیانی ہو تو میں کہوں گا کہ اگر معاذ اللہ مخفی خیال نکاح کوئی عیب تھا تو کیا خدا اپنے رسولوں کو جنہیں وہ بے عیب کر کے دنیا کے سامنے لاتا ہے اور یہی اس کا قانون ہے کیا؟ عیب دار دکھلا کر اور پھر افشائے عیب کر کے انہیں معاذ اللہ مخلوق میں بے وقعت کر کے دکھلانے سے اپنے ہی قانون کو باطل کر سکتا ہے درحالیکہ اُس کے قانون میں نبی کے معنیٰ ہی یہ ہیں کہ وہ معاصی اور گناہوں سے پاک اور مبرّا ہو؟

کیا آپ قرآن کی کھلی اور واضح عبارت سے اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکے کہ قرآن نے تو سرے سے یہ ظاہر ہی نہیں کیا کہ وہ امر مخفی کیا تھا جو نبی پاک کے قلب میں چھپا ہوا تھا اُس نے تو صرف اتنا ہی کہا ہے کہ (اے نبی) "تو چھپاتا تھا اپنے نفس میں ایک بات" اب وہ مخفی بات کیا تھی؟ یا اس کا منشا کیا تھا؟ سو قرآن اس سے ساکت ہے ظاہر ہے کہ یہ امر مخفی جبکہ از قسم واقعات ہے اور واقعات کے دریافت کرنے کی کوئی صورت بجز نقل و روایت کے اور کچھ نہیں تخیل اور تخمین یا قیاس آرائی اس کا ذریعہ نہیں بن سکتے اس لئے قرآن نے جن امور کی طرف مبہم اشارے کئے ہیں اُن کی تفصیل تاریخ و روایت ہی سے معلوم کی جا سکتی تھی۔ سو روایات حدیث اور

آثار صحابہ نے اس مبہم بات کو کھولدیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کا یہ چھپا ہوا خیال حضرت زینب کے نکاح کا خیال تھا جو ان کی متوقعہ طلاق کی صورت میں آنحضرت کے قلب مبارک میں آیا جیسا کہ اوپر کی سطور میں بالتفصیل عرض کیا جا چکا ہے۔ قرآن حکیم نے بھی یہ کہا کہ "آپ دل میں جو بات چھپائے ہوئے تھے اسے اللہ کھولا چاہتا ہے" تو آثار و روایات ہی نے بتلایا کہ اللہ نے جس چیز کو کھول کر واقعہ بتا دیا وہ حضرت زینب کا نکاح تھا جو آنحضرت سے ہوا۔ اس لئے بر دئے بیانات قرآنی واضح ہو گیا کہ وہ امر مخفی نکاح زینب کا خیال تھا اور اس مخفی کا من اللہ اظہار اس خیال کو عملی جامہ پہنا کر بصورت نکاح اسے نمایاں کر دینا تھا اور ظاہر ہے کہ کسی مطلقہ سے نکاح کا خیال قلب میں آنا کوئی برائی نہیں تھی اور بلا ضرورت اس کا اظہار نہ کرنا یا بضرورت اسے چھپائے رکھنا بھی فی نفسہٖ کوئی جرم یا عیب نہ تھا رہا یہ کہ یہ خیال نکاح آنحضرت کے قلب مبارک میں کیوں پیدا ہوا۔؟ سو اسے بھی قرآنی تشریحات نے بتلایا کہ آپ کے ذہن صافی میں یہ خیال اس لئے آیا کہ اگر واقعی زید نے زینب کو طلاق دے ہی دی جیسا کہ وہ بار بار یہ منصوبہ لیکر میرے پاس آرہے ہیں تو اس میں زینب اور ان کے اقارب کی دلشکنی اور ایک گونہ توہین یقینی ہے اور میں اس کا سبب بنوں گا جب کہ میرے ہی ایماء و امر سے زینب نے بادل ناخواستہ یہ نکاح منظور کیا تھا اور اب بھی بار بار اس نکاح کے باقی رکھنے اور طلاق نہ دینے پر میں ہی زید

کو آمادہ کر رہا ہوں تو بصورتِ طلاق اس دل شکنی کا تدارک بھی مجھے ہی کرنا چاہیئے اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ زینب سے میں خود اپنا نکاح کر دوں۔ ظاہر ہے کہ اس پاکیزہ اور کریم النفسی کے خیال کو "عیب" یا "دل کا چور" کہنا اسی کا کام ہو سکتا ہے جس کے دل میں خود چور گھسا ہوا ہو اور اوپر سے اسے قرآن کے سر رکھکر کہنا چوری ہی نہیں سینہ زوری بھی ہے جسے چوری کے بجائے ڈاکہ زنی کہنا چاہیئے۔ ورنہ بتلایا جائے کہ قرآن کے کس لفظ اور لفظ کے کس مفہوم سے اس خیال کا عیب یا دل کا چور ہونا مفہوم ہوتا ہے؟ کیا اسے قرآن اور قرآنی تاریخ پر ایک ناجائز اور مجرمانہ حملہ نہیں کہا جائے گا اور اس کی متعلقہ تاریخ میں اس من گھڑت افسانہ کا اضافہ کھلی تاریخی خیانت نہ ہوگی؟ کہ قرآن ایک امر مخفی کا اعلان کرے اور اس پر اپنی طرف سے ایک بے بنیاد عیب کا لیبل چپکا کر اسے عیب کہدیا جائے۔ پھر قرآن اپنے اشارے اور اپنے بیانات کی رو سے اس کی مستند تاریخ بیان کرے تو اسے چھوڑ کر اپنی ایک فرضی تاریخ کا اس پر اضافہ کر دیا جائے تو کیا یہ قرآن اور اسکی تاریخ والوں پر افترار وبہتان اور صحیح تاریخ کو مسخ کر کے فرضی تاریخ سے دنیا کو مبتلائے فریب بنانا نہیں ہے؟ اور وہ بھی ایک مذہب کے مقتدا یعنی پادری کی طرف سے جس کی دیانت پر پوری قوم کی مذہبی دیانت کا دار ومدار ہے۔

آپ نے بہت زور دیکر قرآن کا یہ لفظ پکڑا ہے وتخشی الناس

یعنی اے نبی آپ اور لوگوں سے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ امر مخفی اُن پر کھل نہ جائے اس سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا کہ لوگوں کے خوف سے کسی بات کو چھپانا یا اس کے کھل جانے سے ڈرنا ہی اس کے عیب ہونے کی دلیل ہے

لیکن میں عرض کردوں گا کہ یہاں بھی وہی جعلی کارروائی کیگئی ہے کہ امر مخفی کا چھپانے کا منشا اپنی طرف سے متعین کر کے قرآن کے سر تھوپ دیا گیا کہ وہ معاذ اللہ "عیب" یا دل کا چور تھا اس لئے آپ لوگوں کی اس کے افشار سے ڈرتے تھے حالانکہ قرآن کا کوئی ایک لفظ بھی آپکی بیان کردہ منشار بلکہ مطلقاً کسی بھی منشا پر دلالت نہیں کرتا دعوے قرآنی تو صرف یہ ہے کہ آپ ایک بات چھپا تے تھے اور لوگوں سے خائف تھے کہ وہ اُن کے سامنے نہ آجائے۔ اب یہ کہ اس چھپانے کی بنیاد اور منشا معاذ اللہ عیب تھا یا صواب، قرآن اس سے ساکت ہے اسے اپنی طرف سے متعین کر کے قرآن کے سر لگانا وہی جعلی کارروائی ہے جسے تحریف و تبدیل کہا گیا ہے اور نصاریٰ قومی طور پر اس کے عادی ہیں۔

دوسرے یہ کہ جس بات کو چھپایا جائے لوگوں کے سامنے لانے سے خوف کھایا جائے وہ عیب اور اخلاقی کمزوری ہی ہوتی ہے خود ایک غیر معقول اور بے دلیل بلکہ خلاف دلیل دعویٰ ہے کیونکہ بات کا چھپانا ہمیشہ اس بات کے عیب یا اپنی کمزوری ہی کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ کبھی دوسروں کی اخلاقی کمزوریوں مثلاً مخاطبوں کی بدفہمی یا بدنیتی کی وجہ سے بھی

ہوتا ہے۔

بارہا ایک مربی اپنے بتدی طالبوں سے باریک باتیں اس خوف سے نہیں کہتا کہ وہ کہیں اپنی کچی سمجھ سے کچھ کا کچھ سمجھ کر مسئلہ کی حدود کو ضائع نہ کردیں جس سے ان کا علم و فکر مشکوک اور مشتبہ ہو جائے تو کیا اسے استاد یا مربی کے دل کا چور کہا جائے گا یا شاگرد کا قلتِ فہم اور نقصان استعداد؟

ایک طبیب اپنے زیر علاج مریض کو بعض پرہیزی غذاؤں کی جائز مقدار بھی اس ڈر سے نہیں بتلاتا کہ یہ غذا طبعاً مرغوب ہے ایسا نہ ہو کہ مریض بتلائی ہوئی حد پر قائم نہ رہ سکے اور زائد از حدود کھا کر ہلاکت کے موتھ میں چلا جائے تو کیا اس خوف کو جو مریض کی طرف سے طبیب کے دل میں پیدا ہوا طبیب کے دل کا چور اور اس کا عیب کہا جائے گا جسے عیب سمجھ کر اس نے کسی مریض سے چھپایا ہے؟

ماں باپ کی اہم بات میں مشورہ اور بات چیت کرتے ہیں تو عموماً بچوں کو وہاں سے ہٹا دیتے ہیں اس ڈر سے کہ ان کی ناسمجھی کی وجہ سے کہیں بات آؤٹ نہ ہو جائے اور اس کا خمیازہ ماں باپ اور خود اس اولاد کو بھگتنا پڑ جائے تو کیا اس اخفاء کو ماں باپ کے دل کا چور کہیں گے یا ان بچوں کی ناسمجھی اور نادانی پر محمول کریں گے حکومتیں اپنے بہت سے حکومتی راز مخصوص افراد کو بتلاتی ہے اور عوام سے اس خوف سے چھپا لیتی ہے کہ وہ ان باریک باتوں کی تہ تک

پہونچ نہ سکیں گے اور سطح کو لے اڑیں گے جس سے دشمن ناجائز فائدہ اٹھا لے جائیں گے اور ادھر عوام میں اصل حقیقت نہ سمجھنے کی وجہ سے حکومت کی طرف سے بدظنی پھیل جائے گی اور اس سے ملت اور حکومت دونوں کے کام کو ناقابل تلافی نقصان پہونچ جائیگا۔ تو کیا اس اخفا کو جو عوام کے خوف سے عمل میں آیا ہے حکومت کا عیب یا اس کے دلی چور سے تعبیر کیا جائے گا۔ یا عین حکمت و مصلحت سمجھ کر عوام کے قصور فہم کا نتیجہ کہا جائے گا، خواہ آخر میں صدر حکومت آخر اسے ظاہر بھی کر دے جبکہ نقصان فہم کا وقت اور خطرہ ٹل جائے تو اسے عین دانش و بینش کہا جاتا ہے نہ کہ حکومت کی کمزوری بہرحال ہر خوف کو خوف کھانیوالے کی کمزوری یا عیب پر محمول کرنا غلط کلیہ اور جاہلانہ بات ہے جس کے نیچے کوئی حقیقت اور بنیاد نہیں۔

آپ دنیا کے عرف ہی پر غور کر لیں تو اس سے بھی یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ جب کسی قوم میں ناجائز باتیں پھیلی ہوئی ہوں اور وہی دین و مذہب بن چکی ہوں تو اس غلط ماحول میں آدمی جائز کام کرتے ہوئے خطرہ محسوس کرتا ہے چہ جائیکہ اُسے زبان پر لائے۔

آج کی دنیا میں مغربی اقوام نے جو بدقسمتی سے بکثرت عیسائی ہی ہیں فحش و بے حیائی اور بدکاری و عریانی کو آخری حد تک پہونچا دیا ہے زناکاری، چوری، شراب خواری، بدعملی اور بد وضعی عام اور عالمگیر ہو چکی ہے بلکہ فن بن چکی ہے جسے کرتے ہوئے لوگ فخر محسوس کرتے ہیں۔

مادیت کا دور دورہ ہے اور روحانیت مظلوم دبے کس ہو کر رہ گئی ہے ایسے مادیت زدہ ماحول اور مادہ پرستوں کے درمیان رہ کر آدمی روحانیت اور خدا پرستی کی باتیں کرتے ہوئے طبعاً جھجک اور بعض اوقات خوف محسوس کرتا ہے نہ اس لئے کہ خدا پرستی کوئی گناہ ہے بلکہ اس لئے کہ مادہ پرست اس کے پاکیزہ عمل کیساتھ تمسخر اور استہزاء سے پیش آئینگے اور اس سے دین کی بے وقعتی اور اہل دین کی توہین ہو گی جس سے غیرت بھی آتی ہے اور خود اس جاہل قوم کی دوامی محرومی کا خطرہ بھی ہوتا ہے کہ اسی بد ظنی میں غرق رہکر کہیں قبول حق سے ہمیشہ کے لئے دست بردار نہ ہو جائے اور وہ اس نیکی کی انجام دہی سے رکنے اور گھبرانے لگتا ہے.

اس میں کشاکش یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف تو اس نیکی کی انجام دہی کا جذبہ اُسے عمل پر مجبور کرتا ہے تاکہ یہ نیکی عملی طور پر قوم کے سامنے آئے اور نیک اسوہ بنے اور دوسری طرف یہ کھٹکا ہوتا ہے کہ یہ ناہنجار مادہ پرست اس کی نیکی کا مذاق اڑائیں گے جس سے روحانیت کی توہین ہو گی تو مقتضائے غیرت دینی اس کے کرنے بلکہ کہنے تک سے بھی رکتا اور خائف ہوتا ہے تو کب اس معقول مصلحت کو اس کے دل کا چور اور نفس کا گناہ تصوّر کیا جائیگا؟

تو اسی طرح اگر خدا کے سچے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ کے قلب مبارک میں (جو عالم کے لئے ہادی و مربّی معلّم و مرشد روحانی طبیب اور روحانی باپ بنا کر بھیجے گئے تھے) ایک سچا خیال بوقت طلاقِ زینب

پیدا ہوا تو کیا اس میں یہ احتمال ممکن نہ تھا کہ اس خیال میں قوم دملت اور دین خداوندی کی بھی کوئی عظیم مصلحت پنہاں ہو سکتی ہے اور وہ مسئلہ کی نزاکت وباریکی اور قوم کی رواج پرستی اور اوپر سے اسمیں دینی مذاق کے فقدان اور ساتھ ہی معاندوں اور منافقوں کی بدفہمی اور بدنیتی کی وجہ سے یہ خوف ہو کہ وہ مسئلہ کو اس کی جائز حدود پر قائم نہ رکھکر اس کی اصلی حقیقت کو مسخ کر ڈالیں گے اور سفہاء و جہلاء کے لئے غلط عنوان سے پروپیگنڈہ کے مواقع فراہم کر دیں گے کہ بیٹے کی جورو کو اپنی جورو بنا لیا اور اس پر طبیعت مچل گئی اور خاطر کے دل میں لو لگ گئی وغیرہ، جس سے حیلہ جو طبیعتوں کو اسلام سے بھاگ نکلنے کی ایک بڑی حجت ہاتھ آجائیگی۔ جس سے پیغمبر کا تو کوئی نقصان نہ ہوگا مگر مخلوق خدا پیغمبر سے بدظن ہو کر اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈال لیگی۔ اس لئے آپ نے اس خطرہ سے اپنے اس خیال نکاح کو مخفی رکھا تو کیا اسے معاذ اللہ نبی کے دل کا چور کہا جائیگا یا معاندوں کے تصور فہم اور نیت بد سے اندیشہ تحفظ کہا جائیگا؟

اور پھر کچھ بھی ہو تصنیف کر کے اس کی تاریخ بنا لینا اور اس کی اصلی اور مستند تاریخ کو چھپا لینا آخر کیا کہلائے گا؟

اس لئے آپ کا یہ کلیہ ہی غلط ہے کہ مخلوق سے خوف کھا کر کسی بات کو چھپانا ہمیشہ اپنے دل کے چور یا ناقابل اظہار عیب کی عیب پوشی ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

بہر حال ایک تو مخلوق سے ڈرنا اور خوف کھانا اپنے نفس کے کسی ناجائز

ارادہ کی وجہ سے ہوتا ہے سو یہ خوف تو انبیاء کے حق میں محال ہے کیوں کہ یہ معصیت ہے اور معاصی سے انبیاء معصوم ہیں اور ایک خوف وخطر اس لئے ہوتا ہے کہ ان کے کسی جائز فعل کی وجہ سے ناسمجھ لوگ کہیں مبتلائے وساوس واوہام ہو کر ایمان نہ کھو بیٹھیں سو یہ خوف انبیاء کے حق میں مستحسن ہی نہیں بلکہ انہیں کا حصہ ہے کیوں کہ اس کی بنا غیرت ایمانی اور کمال عقل و دانش ہے جو انبیاء اور بطفیل انبیاء حکماء وعرفاء ہی کا حق ہے اس قسم کے مصلحت آمیز خوف کے واقعات دنیا میں انبیاء علیہم السلام کی زندگی میں بکثرت پیش آتے ہیں اور کوئی بھی سنجیدہ اور سلیم الطبع انسان انہیں ان کے دل کا چور نہیں سمجھتا بشرطیکہ ایمان کی کوئی رمق اس کے قلب میں موجود ہو۔ مثلاً ابتدا اسلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کا داعیہ تھا کہ کعبہ محترمہ کی اس وقت کی عمارت گرا کر از سر نو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کردہ بنیادوں پر تعمیر فرمائیں لیکن اس خوف سے آپ اس کام سے رکے رہے کہ قوم نئی نئی اسلام لائی ہوئی ہے تو ابھی روحانی ابھی پختہ نہیں ہوئے بیت اللہ کو منہدم ہوتے دیکھکر کہیں یہ نہ کہنے لگے کہ یہ اچھے پیغمبر آئے کہ پہلے خدا ہی کے گھر پر ہاتھ صاف کیا اور اُسے ڈھا دیا ظاہر ہے کہ اس پروپیگنڈہ کا اثر دور رس ہوتا حقیقت حال پر تو کوئی نہ غور کرتا جملہ زبان زد خلائق یہ ہو جاتا کہ نئے پیغمبر نے پہلا کام بیت اللہ کو ڈھا دینے کا کیا اس کا اثر نبی سے بدگمانی

اور بدگمانی کا اثر ایمان اسلام کی محرومی ہوتی جس میں نبی کا کوئی نقصان نہ تھا مخلوق خدا کا دوامی حرمان وخسران تھا اس لئے آپ نے یہ عمل پردہ خفا میں رکھا۔ تو کیا پیغمبر کے اس قلبی خوف کو جو مخلوق کیطرف سے قلب نبوت میں لاحق ہوا اور اس عمل خیر سے مانع آیا عیاذ باللہ نبی کے دل کا چور یا معاذ اللہ ثم معاذ اللہ عیب کہا جائے گا یا تو خیر ملت کے فہم وبصیرت کی کمزوری اور استعداد کے ضعف پر محمول کیا جائیگا جس میں اس باریک بات کے سمجھنے کی ابھی پوری پوری اہلیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

سو اسی طرح اس زیر بحث امر مخفی یعنی نکاح زینب کے خیال کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چھپایا اور اس کے ظاہر ہونے سے آپ لوگوں سے خائف ہوئے تو نہ اس لئے کہ معاذ اللہ یہ خیال کسی عیب اور برائی کا خیال تھا جیسا کہ واضح ہو چکا ہے کہ وہ بصورت طلاق حضرت زینب اور ان کے اقارب کی دل شکنی اور احساس توہین کی تلافی کیلئے تھا جو عین کرم ولطف کا خیال تھا۔ پھر بھی اس کے چھپانیکی وجہ یہ تھی جو احادیث وآثار نے کھول دی ہے کہ یہ خوف معاندین ومنافقین کے غلط پروپیگنڈہ کا تھا جو ایسے مواقع کی تلاش میں رہا کرتے ہیں کہ کسی جائز بات کو ناسازگار ماحول کی مدد سے ناجائز بات کا رنگ دیکر شہرت دیں اور اہل حق کو بدنام کر کے اپنے نفسانی غیض کی شفا کا سامان بہم پہونچائیں اور وہ یہ کہ اس خیالی نکاح کا منشا تو زینب

اور اقارب زینب کی دل شکنی اور توہین کا تدارک تھا لیکن معاندین اس دور کے ماحول کو مشتعل کرنے کے لیے اسے یہ عنوان دیں کہ رسول نے معاذ اللہ نفسانی خواہش یا طبیعت کے مچل جانے کی وجہ سے اپنے لے پالک کی جورو کو گھر میں ڈال لیا اور اپنی بہو سے نکاح کر لیا جو اس دور جاہلیت میں ایک شرمناک عیب شمار ہوتا تھا اس رنگ آمیز پروپیگنڈہ سے نومسلم سادہ لوحوں کو متاثر ہو جانے کا بھی احتمال تھا جو ان کے ایمانوں کے لئے مہلک ہوتا اور مائل بہ اسلام یا قریب ایمان افراد کی ایمان سے محرومی کا سبب بنتا۔ بعنوان دیگر بات تو فی نفسہ جائز تھی اور اس کا انتشار اس سے بھی زیادہ مستحسن اور پاک تھا مگر رواج اور ماحول مخالف ہونیکی وجہ سے دشمنوں کو اس کا غلط انتشار بادر کرا دینے کے کافی مواقع میسر تھے جس سے لوگوں میں نبی سے بدگمانیاں پیدا کرائی جاسکتی تھیں اور وہ اُن کے ایمانوں کے لئے خطرناک ثابت ہوتیں اس لئے اظہارِ خیال سے آپ کو اس کا خوف و خطر لاحق ہوا جو درحقیقت منافقوں کی بدفہمی اور بدنیتی نیز سادہ لوحوں کی لغزش سے تھا نہ کہ معاذ اللہ اس خیال کے عیب یا دل کے چور ہونے کی وجہ سے تھا اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے "وتخفی فی نفسک اور وتخشی الناس سے اشارے فرمائے ہیں جنھیں دین کی مستند تاریخ (احادیث و آثار) نے یہ تفصیل نمایاں کر دیا۔

نظر بریں حالات اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب کے

نکاح کے خیال کو اس وقت ظاہر نہیں فرمایا جبکہ حضرت زید انھیں طلاق دینے پر تلے ہوئے تھے اور آپ انھیں روک رہے تھے لیکن نہ ماننے کی صورت میں بصورت طلاق یہ خیال بھی قلب مبارک میں آرہا تھا جسے آپ زید سے تو حیا ٗ چھپا رہے تھے اور عوام سے اس لئے کہ مسئلہ نازک ہے۔ معاملہ عورت کا ہے جس سے عوام جلد متاثر ہوتے ہیں ایسا نہ ہو کہ معاندین اسی پر رکھکر رسول خدا سے بدگمانیاں پھیلانے کا کام شروع کردیں اور اسلام کی اشاعت میں رکاوٹ پیدا ہو جائے تو کون عقل کا اندھا ایسے دل کا چور یا اخفاء عیب سے تعبیر کرسکیگا ؟ دانشمندوں کی اصطلاح میں اس کا نام دل کا چور نہیں بلکہ نفسیات کی رعایت ہے۔ جس سے کبھی سچا قول اور جائز عمل بھی مخفی رکھا جاتا ہے جو اس قول و فعل کے عیب ہونیکی دلیل نہیں ہوتی بلکہ ناتکمیل یافتہ افراد اور معاشر مخاطبوں کے پر از قصور و کوتاہی ہونے کی نشانی ہوتی ہے اس لئے اسکا اخفاء ہی مصلحت ہوتا ہے۔

اس پر بھی اس خوف کو دل کے چور سے تعبیر کرنا کیا خود اپنے ہی دل کے چور کی دلیل ہے کہ بات کا واضح اور صحیح پہلو تو دل میں نہ آئے اور تلاش کر کرکے اس کے غلط اور ناپاک پہلو نکالنے کی کوشش کی جائے ؟ اور یا پھر مقام نبوت کی عظمت سے انتہائی لاعلمی کی دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی پاک طبیعتوں کو جن پر شریعتیں اترتی ہیں اپنی ناہموار طبیعتوں پر قیاس کرکے یکساں حکم لگا دیا جائے کہ جیسے ہم اپنی ناجائز

اغراض کی وجہ سے بمقابلہ حکمِ خداوندی مخلوق سے ڈرتے ہیں کہ کہیں بات نہ کھل جائے اور کی کرائی پر پانی نہ پھر جائے۔ ایسے ہی معاذ اللہ انبیار بھی ناقابلِ اظہار اغراض کی خاطر مخلوق سے ڈرتے تھے کہ کہیں اندرونی اغراض کا پردہ فاش نہ ہو جائے۔ سو اس قسم کے فاسد خیالات اُن سے تو ممکن ہیں جو نبی کو خدا اور خدا کو خاوند اور باپ بنادیں لیکن اُن کے ممکن نہیں جو نبی کو بشر مانتے ہوئے ہر ظاہری باطنی عیب و ذنب سے منزّہ اور معصوم یقین کرتے ہوں اور خدا کو اپنے نبی کا ناصرو معیّن اور نبی کو ہر حالت میں اپنے خدا کے منشار کا محب اور مطیع دپابند مانتے ہوں۔

بہر حال معاملات کے سلسلہ میں انبیار کا اظہارِ خیال اور اخفارِ حال دونوں ہی منشارِ حق اور ایمارِ الٰہی سے ہوتا ہے طبعی یا نفسانی جذبات سے نہیں ہوتا حقانی اجتہاد سے ہوتا ہے۔ دماغی سوچ بچار سے نہیں ہوتا اس لئے تخفی فی نفسک کی یہ اختراعی تفسیر اور دینی تاریخ کے برعکس یہ اپنی اور من گھڑت تاریخ لغویت اور خیالِ خام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

یہ الگ بات ہے کہ مسئلہ میں نبی کی اجتہادی مصلحت کبھی حق تعالیٰ کے یہاں قابلِ تسلیم ہوتی ہے تو اسے باقی رکھا جاتا ہے اور قابلِ تسلیم نہیں ہوتی تو اس سے نبی کو اسی وقت ہٹا دیا جاتا ہے اور اس کے خلاف کو من اللہ ظاہر کر دیا جاتا ہے مگر اس سے نبی کے پاک

قلب پر حرف گیری مقصود نہیں ہوتی گو اسمیں نبی کے قرب خاص اور مخصوص تعلّق کی وجہ سے حق تعالیٰ کا انداز خطاب تیز بھی ہو جس سے صرف یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ آخر اس تقرّب کامل کے ہوتے ہوئے آپ کا قلب اس مرجوح مصلحت کی طرف کیوں جھکا ؟ راجح کی طرف کیوں نہیں گیا ؟

مگر یہ عنوان خود اظہار شفقت کرم اور اعلان تعلّق کی علامت ہوتا ہے نہ کہ اظہارِ ملامت وبیزاری یا حرف گیری کا۔ سو اس موقعہ پر بھی حق تعالیٰ نے آنحضرت کے اس اخفاء خیال کی تائید نہیں فرمائی بلکہ قدرے تنبیہ آمیز لہجہ میں خطاب فرمایا کہ آپ تو خیال نکاح زینب کو چھپانا چاہتے تھے لیکن اللہ اسے ضرور ظاہر کرے گا کیونکہ یہ چھپانے کی یہ مصلحت کہ لوگوں میں اس خیال کے افشاء پر نبی سے بدظنی پیدا نہ ہو جو ایمان سے محرومی کا سبب ہے۔ اتنی اہم نہیں جتنا کہ اس کے اعلان کی یہ مصلحت اہم تھی کہ لے پالک کی بیوی سے اس نکاح کو حرام سمجھنے کی جاہلانہ رسم ہمیشہ کیلئے ٹوٹ جائے۔ پہلی مصلحت کا اثر تو صرف یہ تھا کہ کچھ لوگ نبی سے بدظنی میں مبتلا ہو کر ایمان سے محروم نہ رہ جائیں سو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی معمولاً دنیا میں ہزاروں کفار انبیاء پر ایمان نہیں لاتے اور بدظنیاں قائم کر کے جہنم کے مستحق بن جاتے ہیں۔ ایسا ہوتا رہا اور ایسا ہوتا رہیگا حقیقی مصلحت اور اہم بات یہ تھی کہ اس خیال کے اظہار سے دین کا ایک اہم حکم دلوں میں بیٹھنا

اور عملاً جاری ہو جاتا۔ پس کسی شخص کی ایمان سے محرومی اتنی ہی اہم نہیں جتنی کہ دین کے کسی مسئلہ کے اظہار و استحکام سے دین کی تکمیل اہم ہے جس کے طفیل انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ بہر حال ان دونوں مصالح میں یہ فرق اہم اور غیر اہم یا حق اور احق کا تھا حق و ناحق کا نہیں تھا کہ مریضان قلب ایسے عنوانوں سے اس احقؐ ان تخشاہ کے عنوان کو غلط معنی پہنا کر نبی کے پاک قلب کو معاذ اللہ جذبات نفس اور نفسانی خواہشات سے متہم کرنے کا نامعقول طعنہ دینے لگیں یہ تخفی فی نفسک کے بارے میں ایک پہلو تھا جس کے بارہ میں حقیقت حال ظاہر کی گئی۔

لیکن اسی کے ساتھ اگر آپ دماغ پر بوجھ ڈال کر اس پر بھی غور فرمالیتے کہ اگر اس نکاح کا یہ خیال مخفی معاذ اللہ رسول کی اخلاقی کمزوری یا شہوانی جذبہ اور عیب کی بات تھی جس کو وہ چھپانا چاہتے تھے اور جیا ذباللہ دل کے اس "چور" کے کھل جانے پر کی کرائی پر پانی پھر جانے پر کا خطرہ محسوس کر رہے تھے تو سوال یہ ہے کہ آخر رسول کو اس عتاب آمیز آیت کے اظہار اعلان کی کیا مجبوری تھی؟ اور کیا ضرورت تھی کہ وہ جانتے بوجھتے بھی اپنی بدنامی کا خطرہ خود اپنے ہاتھوں مول لیں۔ اگر آنحضرت اس آیت کو ظاہر نہ فرماتے تو کسی کو کیا خبر ہو سکتی تھی کہ ان کے قلب میں کیا چھپا ہوا ہے اور کیا آیت نازل ہوئی ہے؟ اور کون ان سے مطالبہ کر سکتا تھا کہ آپ نے فلاں آیت کیوں ظاہر نہ فرمائی سب کہ انہی کے ظاہر کئے تو

ظاہر ہو سکتا تھا کہ یہ قرآن ہے اور یہ اس کی آیت ہے وہ ظاہر نہ فرماتے تو قرآن کو قرآن کون سمجھنے والا تھا ؛ اور یا پھر کم سے کم اس آیت کو قرآنی کتابت کے وقت لکھایا نہ جاتا کہ قیامت تک آپ کے لئے اس الزام واتہام کا دروازہ کھلا رہتا ؛ لیکن اس کے باوجود اس آیت اخفار کو بلا کم وکاست اظہار اور قرآن میں اس کا ہونا جہاں اللہ کے رسول کی کامل امانت ودیانت اور قلب کی صداقت وراست بازی کی کھلی دلیل ہے وہیں اس کی بھی کھلی نشانی ہے کہ جھوٹے معترضوں کے علی الرغم اس میں "دل کا چور" کا کوئی ادنیٰ شائبہ تک نہ تھا ورنہ خود سے اس آیت کو ظاہر کر کے جبکہ بقول آپ کے "اندر سے ڈر لگ رہا تھا" اپنے کو مطعون بنانے کی یہ راہ کیوں ڈالی جاتی ۔ اگر آپ کہیں کہ اس آیت کے اظہار میں مجبوری یہ بھی کہ وہ خدا کی طرف سے اترا ہوا حکم ہوا تھا اسے آپ کیسے چھپا سکتے تھے ۔ تو میں عرض کروں گا اس سے تو آپ کی رسالت ونبوّت اور اس کی صداقت وامانت خود آپ ہی کی زبان اعتراض سے ثابت ہوتی ہے ظاہر ہے کہ اس صورت میں رسول کو رسول مان کر رسول کے دل میں کوئی کھوٹ یا دل کا چور ماننا اجتماع ضدّین اور ماننے والوں کے دل کے کھوٹ کی کھلی نشانی ہے کہ وہ رسول کو رسول بھی کہیں اور پھر اس کی گناہگاری کا ناپاک تصور بھی باندھیں ۔

بہر حال ان آیتوں کا قرآن میں ہونا اور حضور کا دوسری آیات قرآنی کی طرح انھیں بلا کم وکاست پڑھ کر سنانا ہی ان شبہات کا قرار واقعی جواب ہے ۔ اگر معاذ اللہ یہ چھپایا ہوا امر قلب کا کوئی عیب ہوتا جسے

آپ عیب ہونے کی وجہ سے چھپانا ضروری سمجھتے تھے تو اِن آیات کو کبھی نمایاں ہی نہ ہونے دیتے اور پڑھکر ہی سناتے۔ بہرحال تخفی فی نفسک اور تخشی الناس کے قرآنی الفاظ سے یہ فرضی افسانے گھڑ کر اس کی تاریخ کو بگاڑنے اور اس غلط ملط تاریخ کی رو سے اس پر اعتراض کرنا قرآن پر اعتراض نہیں بلکہ خود اپنے اوپر ہے جبکہ اپنے ہی مفروضات پر ہے جن کا نہ قرآن سے تعلّق ہے نہ قرآن کی تاریخ سے۔ اس لیے نمبر ۱ کی طرح یہ نمبر ۲ بھی آپ کا فرضی منصوبہ ثابت ہوتا ہے جس کا قرآن حکیم کی سچی اور سادہ خبروں اور احکام پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا

آپ کے اس اعتراض کا ایک اہم جزو یہ طنز بھی ہے کہ لے پالک کی بیوی سے یہ نکاح رسول خدا نے بلا حجتہ کیا حجتہ دلیل کے بعد آئی یا فوراً ہی منگالی گئی چنانچہ اس سلسلہ میں آپ کی واضح عبارت یہ ہے کہ جب اپنی بہو (بیٹے کی بیوی) پر طبیعت مچل گئی تو فوراً وحی آسمانی (قرآن) نے ساری روحانیت اور نیکی اور سچائی پر ایسا بھاری پردہ ڈال دیا کہ تمام دینداری چھپ گئی اور اپنے بیٹے کی جورو کو اپنی جورو بنانے کا حق اللہ میاں سے حاصل ہو گیا' (آپ کا خط)

یہ نبی کی ذات اور قرآن دونوں ہی پر بیک قلم حملہ ہے نبی پر تو بزعم خود ایک ناجائز فعل کی تہمت اور قرآن پر ناجائز کی پردہ پوشی اور سند جواز دیدینے کا اتہام۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ معاذ اللہ رسول اور قرآن دونوں سازشی ہیں رسول جب من مانی کارروائیاں کر لیتے ہیں تو فوراً قرآن

تائید بیکر اُتر آتا ہے اور یہ کہ عملی کارروائی پہلے ہو لیتی ہے بعد میں قرآنی قانون آجاتا ہے اور اپنے کام کے لیئے سند جواز منگالی جاتی ہے بالفاظ دیگر معاذاللہ نبی کا عمل قانون کے تحت نہیں اپنی مرضی کے تحت ہوتا ہے قانون محض اپنے بچاؤ کے لئے لبعد میں آتا ہے اور قانون کوئی اصولی حجت لئے ہوئے نہیں جو نبی نے کرلیا وہی اس نے بشکلِ آیت سامنے لاکر رکھدیا۔ اِسکا حاصل یہ نکلا کہ جب رسول نے بے بالک کی بیوی سے نکاح کیا اُسوقت قرآن میں اس کے بارہ میں کوئی اصول نہیں تھا یہ سب آیتیں اس واقعہ کے بعد ہی اتریں جن کا شانِ نزول بھی واقعہ ہے ۔اس لیئے نبی کا عمل معاذاللہ بلا حجتّ رہا۔

میں عرض کروں گا کہ اس سے اولاً تو آپ کے علمی کردار کا اندازہ ہوتا ہے کہ جب مطالبۂ دلیل کا موقعہ آتا ہے تو آپ ہر بات کی دلیل قرآن سے مانگتے ہیں اور جب قرآن سے کوئی بات سامنے آجاتی ہے تو قرآن کو سازشی اور حق پوشش کہکر اس سے راہِ فرار اختیار کرلی جاتی ہے یہود ونصارٰی کی یہ خصلت آج کی نہیں قدیم اور پشتینی ہے جسے قرآن نے تیرہ صدی پیشتر ہی بتلا دیا تھا کہ وہ کسی کے نہیں نہ حق کے نہ باطل کے صرف بندگانِ اغراض ہیں جدھر غرض پوری ہوتی دیکھی اُدھر ہی ڈھل گئے۔

اللہ کے رسول کی بعثت سے پہلے تو مشرکین عرب کو دھمکاتے تھے۔ کہ عنقریب رسول عربی ظاہر ہونے والے ہیں ہم اُن سے ملکر تم پر غلبہ حاصل کرلیں گے ۔لیکن جب وہ رسول عظیم ظاہر ہوا تو بچھے ہوئے حسد سے

رسول کا تو انکار کر دیا اور بمقابلۂ رسول انہیں مشرکین عرب سے جا ملے اور طرح طرح کی سازشیں کر کے اسلام رسولِ اسلام اور امتِ مسلمہ کے مدمقابل آ گئے۔

وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہ فلعنۃ اللہ علی الکفرین بئسما اشتروا بہ انفسھم ان یکفروا بما انزل اللہ بغیا ان ینزل اللہ من فضلہ علی من یشاء من عبادہ فباءوا بغضب علی غضب وللکفرین عذاب مھین۔

حالانکہ اس کے قبل وہ (خود) بیان کرتے تھے کفار سے پھر جب وہ چیز آ پہونچی جسکو وہ (خوب جانتے پہچانتے ہیں تو اس کا صاف) انکار کر بیٹھے سو بس خدا کی مار ہو ایسے منکروں پر وہ حالت بہت ہی بری ہے جسکو اختیار کر کے وہ اپنی جانوں کو چھڑانا چاہتے ہیں (اور وہ حالت یہ ہے کہ کفر کرتے ہیں ایسی چیز کا جو حق تعالےٰ نے نازل فرمائی محض اسی ضد پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس بندے پر اسکو منظور ہو نازل فرماوے سو وہ لوگ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے اور ان کفر کرنے والوں کو سزا ہوگی جسمیں ذلت (بھی) ہے

یا تو رسول برحق کے لے پالک کی بیوی سے نکاح کے مسئلہ میں شبہا وسوسہ کا جواب قرآن سے مطلوب تھا یا جب اس بارے میں قرآن کی ایک آدھ نہیں کئی آیتیں دیکھیں تو پیشبندی کے طور پر انہیں آیتوں کی ساتھ تمسخر کی راہ اختیار کرتے ہوئے نبی اور قرآن دونوں کو بیک قلم سازشی اور متہم ٹھہرانے کی ٹھان لی کہ نبی تو معاذ اللہ ایک خلاف رد صابیت فعل یعنی نفسانیت کی حرکت کے مرتکب ہوئے کہ اپنی

بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا اور پھر فوراً ہی قرآن اس ناجائز فعل کا حق دلانے اور سندِ جواز پیش کرنے کے لئے آ کھڑا ہوا۔ حالاں کہ دین اور دینی احکام کے بارہ میں نبی کی ذات خود سند اور حجت ہوتی ہے۔ نبی کا کہا ہوا اور کیا ہوا شریعت ہوتا ہے۔ آسمانی کتاب بھی اگر حجت مانی جاتی ہے تو نبی ہی کے کہنے سے مانی جاتی ہے۔ انجیل و قرآن اگر حجت ہیں تو اُن کا حجت ہونا حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت محمد علیہ السلام ہی کے فرمانے سے تو معلوم ہوا تو اصل حجت نبی ہی کا قول و فعل نکلا۔ پھر یہ کہنا کہ نبی نے فلاں کام بلا حجت کیا۔ اجتماعِ ضدین کا دعویٰ ہے کہ ان کا قول فعل حجت بھی ہو اور نہ بھی ہو۔ چنانچہ اس تحریر کے مقدمہ میں اصولی طور پر یہ مسئلہ بقدرِ ضرورت واضح کیا جا چکا ہے اس صورت میں اگر قرآن کریم نبی کے کسی فعل کے بعد بھی آئے اور اس فعل کی تائید لے کر آئے تو یہ بے حجتی کب ہوئی ؟ ہوئی تو دو حجتی ہوئی جیسمیں دو حجتیں جمع ہو گئیں۔ ایک فعل رسول کہ وہ خود حجت شرعی ہے دوسرے کلام الٰہی کہ وہ اصلی اور بنیادی حجت ہے۔ تو لے پالک کی مسئلہ میں اگر قرآن بعد ہی میں اترا ہوا مان لیا جائے تب بھی اس فعلِ رسول کو بے حجت نہیں کہا جائے گا اور یہ دعویٰ کیا جانا ایک وہم کہ ہو گا کہ فعل رسول کی بنیاد قرآن پر نہیں ہے

ساتھ ہی میں یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ قرآن کا طریقِ نزول عموماً یہ رہا ہے کہ اسکی آیتیں واقعات و حوادث پیش آنے پر اترتی رہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ کسی حادثہ کے پیش آنے پر اس کا حکم بروقت سامنے

ذہن نشین بھی ہوتا ہے اور سبب نزول کے ساتھ مل کر اس واقعہ کے سلسلہ سے محفوظ بھی ہو جاتا ہے صاحب واقعہ اور اس کا ماحول کبھی بھی اس حکم کو فراموش نہیں کر سکتا۔ نیز واقعہ کے تمام عملی پہلو چونکہ حسّی طور پر لوگوں کے سامنے آچکے ہوتے ہیں اس لئے اس کے متعلقہ حکم کے وہ سارے علمی اور نظری گوشے بھی ان کے سامنے واضح اور نمایاں ہو جاتے ہیں جو اس واقعہ کے گوشوں سے متعلق ہوتے ہیں جس سے حکم کی جامعیت بھی کھل جاتی ہے اور حکم کے ایک ایک پہلو کا واقعہ کے ایک ایک پہلو پر انطباق بھی ہو جاتا ہے اور اس طرح قوم کا علم اور عمل دونوں جامع اور ایک دوسرے کے مطابق ہو کر نمایاں اور راسخ ہو جاتے ہیں جس سے حکم میں کسی تاویل و تبدیل کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور ممکن نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی من مانا تغیر تبدیل کر دے جبکہ محض حکم کے الفاظ ہی سامنے نہیں ہوتے جن میں تاویلات کر کے من مانی کارروائی کر لیجائے بلکہ وہ واقعہ بھی سامنے ہوتا ہے جس کے لئے یہ حکم اُترا ہے تو حکم کا مفہوم اور مصداق بھی دونوں متعیّن اور لاتبدیل بن جاتے ہیں اس لئے کسی تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہتی یہی وجہ ہے کہ قرآن تحریف و تبدیل سے مبرّا ہے کیوں کہ اس کے احکام و تعبیر میں محض لفظ ہی نہیں اور محض معنیٰ ہی نہیں بلکہ دونوں جمع بھی ہیں اور دونوں ایکدوسرے پر منطبق بھی ہیں حکم بھی لوگوں کے سامنے ہے اور اس کا واقعہ بھی اُن کے سامنے ہے جس سے لفظ اور معنیٰ دونوں

کسی ردّ و بدل یا تاویل و تحریف کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہ روش اس لئے اختیار کیگئی کہ قرآن آخری نبوت کی آخری کتاب تھی جسے قیامت تک باقی رکھنا تھا اس لئے اس کے تحفظ اور ناممکن التبدیل ہونے کے جہاں اور سامان کئے گئے وہیں یہ سامان بھی کیا گیا کہ اس کے ایک ایک حکم کو حوادث و واقعات کے سلسلہ سے اُتارا گیا اور اسی لئے تئیس برس میں اس کا نزول مکمل ہوا۔ جس سے اسکا ایک ایک ٹکڑا ذہنوں اور تاریخ میں مشخص ہوتا گیا اور بالآخر مجموعہ مع اپنے اسباب نزول کے دوامی طور پر محفوظ ہو گیا۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دو آدمیوں کو دیکھا کہ کسی آیت قرآنی کے بارہ میں محض عقلی احتمالات نکال نکال کر رائے زنی سے لڑ جھگڑ رہے ہیں تو آپ غضبناک ہو گئے اور فرمایا۔

اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِاخْتِلَافِهِمْ فِي الْكِتَابِ (رواہ مسلم) — بلا شبہ تم سے پچھلی قومیں (اہل کتاب) ہلاک ہو چکی ہیں (اپنی آسمانی) کتاب میں اپنی رائے زنی کے اختلافات اٹھانے سے۔

لیکن قرآن حکیم کے حکم میں اگر کوئی شخص رائے زنی سے اختلاف کرتا ہے اور اس کے معنی میں کوئی تاویل کر کے اس کے حکم کی تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو فوراً اس آیت کا شان نزول یا سبب نزول سامنے کر کے اس حکم کا واقعی مفہوم اور مصداق سامنے کر دیا جاتا ہے جس سے اس کی رائے زنی ختم ہو جاتی ہے اس لئے اس قسم کے خود غرض افراد حدیث کے انکار پر تلجاتے ہیں اور اس کی حجیّت کے منکر ہو جاتے ہیں کیونکہ یہی احادیث دین و قرآن

کی عظیم ترین تاریخ ہے جس سے قرآنی احکام کا مفہوم اور مصداق متعیّن ہوتا ہے اور اسکے تعیّن کے بعد بالہوسوں کی یاوہ زنی بے اعتبار اور محض ہوسناکی ہو کر رہ جاتی ہے جسکی طرف کوئی التفات نہیں کرتا۔ اب اگر اسی اصول اور قرآن کی اسی عادت کے مطابق کہ عموماً واقعات پیش آنے پر ہی اسکے احکام آسمان سے اترتے رہے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی نبوی فراست سے ایک عمل کیا (یعنی اپنے لے پالک کی بیوی سے نکاح فرمالیا) جسکے عدم جواز کی کوئی دلیل سامنے نہ تھی اور عقل دینی فراست ایمانی اور وجدان نبوّت اس کے جواز کے حق میں تھے اور اُس کے واقع ہونے پر حسب معمول قرآن فوراً اُتر آیا جس نے اس فعل کی تائید کی بلکہ اس کے فطری اصول بھی سمجھائے جس سے یہ عمل صرف ذات نبوی کیلئے خاص نہ رہا بلکہ پوری امت کے لیے اس نکاحوں کے جواز کا دستور عمل بنگیا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اسمیں اعتراض کی کیا بات ہے کہ اُسے ان طنزیہ لفظوں سے تعبیر کیا جائے کہ فوراً وحی آسمانی آگئی اور اپنے بیٹے کی جورو کو اپنی جورو بنانیکا حق اللہ میاں سے حاصل ہو گیا۔

کیا اہل کتاب انبیاء کی فراست اور صحیح ذوق و وجدان کے قائل نہیں؟ کیا اُنکے یہاں انبیاء نے کبھی کوئی فعل ایسا نہیں کیا کہ بعد میں خدا نے اسکی تائید کی ہو یا اس پر انکار کیا ہو اور اُس خطاءِ اجتہادی سے ہٹا دیا ہو اسلئے نبی کے فعل کے بعد کسی منشاء خداوندی یا حکم الٰہی کا اُسکی تائید یا انکار کیلئے اُترنا کونسی ایسی غیر فطری یا غیر معقول بات تھی کہ اس پر طعنہ زنی کیجائے؟ یہ تو واقعہ کے تحفظ اور حکم واقعہ کی پوری پوری حفاظت کا راستہ ہے نہ کہ اتہام و اعتراض کا۔"

لیکن جو کچھ عرض کیا گیا تنزل کے طور پر اور اعتراض کو واقعہ مان کر عرض کیا گیا۔ ورنہ یہ دعویٰ ہی غلط اور واقعہ کے خلاف ہے کہ رسول خدا کے اس عمل کے بعد قرآن میں یہ حکم نازل ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ لے پالک کا مسئلہ اور فرضی اور اصلی بیٹے کے احکام کے فرق کا اصول قرآن نے اس سے پہلے ہی پیش کر دیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت زینب کے نکاح کا واقعہ رونما ہو۔ بالفاظ دیگر اللہ کے رسول نے یہ لے پالک کی بیوی سے نکاح قرآن کے پیش کردہ اصول کے تحت فرمایا۔ محض اپنے ضمیر صافی پر عمل نہیں فرمایا درحالیکہ وہ بھی شرعی حجت تھا یعنی صورت حال یہ نہیں ہے کہ نکاح کرتے ہی فوراً وحی آسمانی سند جواز لیکر آگئی بلکہ یہ ہے کہ قرآن میں ایسے نکاحوں کا اصولی جواز آجانے کے بعد رسول خدا نے اس کے تحت اپنا عملی اسوہ پیش فرمایا اس لیے یہ قرآنی احکام کے نزول سے ناواقفیت یا جان بوجھکر کتمان حق کیسا تھ فریب دہی ہے کہ لے پالک کی بیوی کے نکاح کے بارہ میں بوقت نکاح قرآن کو ساکت کہا جائے جب کہ وہ ناطق ہو چکا تھا یہ دھو کہ درحقیقت یہاں سے لگا کہ لے پالک کے بارہ میں صرف وہی آیتیں سامنے رکھ لی گئیں جو خاص اس واقعہ سے متعلق نازل ہوئی تھیں جنھیں سطور بالا میں تفصیل سے پیش کیا جا چکا ہے۔ لیکن وہ آیت یا اعتراض کنندوں کے سامنے ہی نہیں آئی اور بوجہ جہالت اس سے بے خبر ہے جو اس مسئلہ کی حقیقت اور اس کا حکم کھولنے کے لئے اتری

اور یا بوجہ عناد اُسے سامنے لانے سے گریز کیا گیا ہے، اور کتمان حق سے کام لیکر تلبیس کی راہ اختیار کی گئی جو اہل کتاب کا قدیم شیوا ہے جسے قرآن نے دانشگاف کرتے ہوئے انہیں اس سے باز رہنے کی نصیحت کی تھی۔ ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون۔

درحالیکہ اس آیت کریمہ میں حضرت زید کے واقعہ سے الگ ہو کر صرف اس مسئلہ کے بنیادی اور حقیقی پہلو سے بحث کیگئی ہے کہ آیا لے پالک حقیقی بیٹا بن بھی سکتا ہے یا نہیں ؟ اور نہیں بن سکتا تو اُسکی علّت کیا ہے یہ آیت پیش کرنے سے پیشتر میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کا قرآنی ماحصل اور آیت مجولہ کے مضمرات ذہن سے قریب تر کردینے کیلئے پہلے اُن کی ترتیب پیش کر دوں تاکہ پھر آیت سامنے آنے پر دہ اِن مضمرات پر پوری پوری چسپاں دکھائی دے اور مسئلہ اپنی حقیقت کے ساتھ ذہنوں میں آیا ہوا ہو۔ سو قرآن نے اس مسئلہ کی فطری بنیادیں کھولنے کے لئے پہلا قدم تو یہ اُٹھایا کہ۔

(۱) بیٹے اور حقیقی اولاد ہونے کے معنی کی وضاحت کی اور اولاد ہونیکی حقیقت پر روشنی ڈالی تاکہ اولاد غیر اولاد سے بلحاظ معنیٰ و مفہوم الگ الگ متعین ہو جائے؟ اور اُن میں کسی قسم کا التباس اور اشتباہ باقی نہ رہے قرآن نے اس بارہ میں جو فطری اصول پیش کیا اس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ "بیٹا" کوئی اصطلاح نہیں ہے جسے لوگوں نے وضع کر لیا یا فرض کر لیا ہو کہ جب اصطلاحی طور پر یہ لفظ کسی پر بول دیا جائے تو

اُسے بیٹا سمجھ لیا کرو اور وہ یہ لفظ بولتے ہی حقیقتاً بیٹا بن جایا کرے گا اور جب لوگ یہ اصطلاح بدل دیں مثلاً اُسے باپ کہنے لگیں تو جب ہی وہ باپ بن جائے گا اور اب اُسے باپ ہی سمجھ لینا چاہیئے گویا باپ یا بیٹے ہونیکا کوئی واقعی مفہوم خود متعین نہیں بلکہ لفظ اور اصطلاح پر دار و مدار ہے کہ جب کسی ذات پر فلاں لفظ بولدیا جائے تو تمہیں یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ اور جب لغت بدل جائے اور فلاں لفظ بولا جائے تو تم بدلے ہوئے معنی سمجھ لیا کرو اور اسی کے احکام اُس ذات پر جاری کر دیا کرو۔ لیکن حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے اور وہ یہ کہ لفظ بیٹا کوئی اصطلاح نہیں بلکہ لغت ہے جس کے معنی وضعی طور پر متعین ہیں اور وہ انھیں متعینہ معنی کے سمجھانے کے لئے وضع کیا گیا ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ اس لغت کی حقیقت اور معنی جس کے لئے یہ لغت وضع کی گئی ہی پہلے سے موجود اور ذہنوں میں متعین ہوں کیوں کہ حقیقت پہلے بنتی ہی اور الفاظ اس کے اظہار کے لئے بعد میں وضع ہوتے ہیں یہ نہیں کہ الفاظ بنا کر اُن کی وجہ سے حقیقت وضع کی جائے اور اُن میں ڈالدی جائے بلکہ پہلے سے موجود اور متعین شدہ معنی کے بتلانے کے لئے خدائے تعالیٰ لغت اُتارتا ہے۔ پس لغت کے معنی خدا کی طرف سے متعین ہوتے ہیں اور اُن کے اظہار کے لئے لفظ بھی اسی کی طرف سے اُتلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اصطلاح کے معنی یہ ہیں کہ لوگ ایک مفہوم کو خود ہی فرض کرلیں اور اُسے سمجھانے کے لئے خود ہی الفاظ وضع کرلیں

پس لغت میں پہلے سے ایک حقیقت ثابت شدہ اور واقعی ہونی چاہیے۔ لیکن اصطلاح کے لئے یہ ضروری نہیں۔ غلط سے غلط معنیٰ کے لئے ہم اچھے سے اچھا لفظ وضع کر سکتے ہیں۔ پس جبکہ بیٹا لغت ہی کی اصطلاح نہیں تو اس کے حقیقی معنی پہلے سے متعیّن شدہ ہونے چاہیئیں۔ ورنہ باپ بیٹے کا فرق ہی دنیا سے معدوم ہو جائے یا واقعی ہونے کے بجائے فرضی اور اختیاری رہ جائے کہ جب چاہو بیٹے کے معنی باپ کے لیلو اور جب چاہو باپ کے معنی بیٹے کے سمجھ لو۔ درحالیکہ اظہار حقائق کیلئے لغت قدرتی ہے اسے اپنی اختیاری اصطلاح قرار دے لینے کا کسی کو حق نہیں۔ لیکن اگر آپ کی خاطر سے اُسے بطور اصول ہی کے تسلیم کر لیا جائے کہ لفظ بیٹا لغت نہیں اصطلاح ہے تب بھی لے پالک کے بارہ میں آپ کا مدّعا پورا نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ تو فرمائیں گے کہ لے پالک ہماری ایک اصطلاح ہے جس کے معنی حقیقی بیٹا بنجانے کے نہیں۔ لہذا اس کے بولتے ہی وہ حقیقی بیٹا بن جائے گا اور ہم آپ ہی کے اصول پر یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ لے پالک کے معنی ہماری اصطلاح میں محض محلّ شفقت و محبّت بنا لینے کے ہیں حقیقی بیٹا بنجانے کے نہیں اس اصطلاحی لڑائی کا حاصل یہ نکلیگا۔ کہ حقائق واقعی ہونے کے بجائے فرضی رہ جائیں گی اور اُن کے اظہار کا دارومدار بھی ہماری ہی اختراع کردہ اصطلاحوں پر رہ جائیگا کہ جو چاہیں ذہنی معنی متعیّن کر کے جو لفظ چاہیں اس کے اظہار کیلئے

بطور اصطلاح استعمال کرلیں تو نہ دنیا میں احقاقِ حق باقی رہے گا نہ ابطال باطل۔ نہ کوئی کسی پر حجت قائم کر سکے گا نہ حق و ناحق کے معیار سے ہدایت و رہنمائی کا کوئی راستہ ہی قائم رہیگا سارے انسان بندگانِ نفس اور اسیرانِ ہوا و ہوس ہو کر رہ جائیں گے اور جو چاہیں گے لفظوں کے ہیر پھیر سے کام نکال لیا کریں گے۔

فرض کیجئے کہ کسی لڑکی کو آدمی شفقتانہ بہن کہکر پکارے تو اسی آن اسے حقیقی بہن بن جانا چاہیئے اور اگر اس کے بعد وہ اس سے نکاح کا پیغام دے تو نکاح درست نہ ہونا چاہیئے کیوں کہ وہ حقیقی بہن بن چکی ہے جس سے نکاح جائز نہیں بلکہ آپ کے اصول پر تو کسی بھی مرد کا کسی بھی عورت سے کسی بھی حالت میں نکاح صحیح ہی نہ ہونا چاہیئے اور جنھوں نے کر لیا ہی وہ بحیثیت عیسائی ہونے کے سب زنا کے مرتکب ہو رہے ہیں کیوں کہ آپ ہی نے اپنے والا نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ۔

"اگر ہم بائبل کو پڑھیں تو اپنی ایک بیوی کے علاوہ تمام دیگر عورتوں کو ماں، بہن، بیٹی کہا گیا ہے"

اور جب کہ یہ کہا جانا ہی مفروضہ کو واقعہ بنا دیتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نکاح سے پہلے ہی یہ بیوی حسب تصریح بائبل ماں، بہن، بیٹی بن چکی تھی تو پھر یہ نکاح ماں، بہن، بیٹی سے کیسے درست ہو گیا جب کہ یہ لفظ بولتے ہی وہ واقعی ماں، بہن، بیٹی بن چکی تھی؟ نیز اس منکوحہ بیوی کے فوت ہو جانے پر اس عیسائی مرد پر نکاح ثانی بھی حرام ہو کر زنا کے

حکم میں آجانا چاہیئے کیوں کہ اس بیوی کے علاوہ جب کہ ساری کی ساری عورتیں از روئے بائبل ماں بہن بیٹی پکارے جانے سے واقعی ماں، بہن بیٹی بن چکی تھیں اور یہ لفظ بولتے ہی اُن کی ماہیت بدل گئی تھی کہ وہ حلال ہونے کے بجائے ابدی طور پر حرام ہو چکی تھیں تو وہ نکاح میں کیسے آسکے گی اور لائی جائیں گی تو نکاح کے نام سے زنا کا کارخانہ کھل جائیگا آپ کے فرمودہ کے مطابق گویا سارے انجیل کے ماننے والے حلال اولاد سے محروم ہیں اور کسی کا بھی گھر صحیح قسم کی منکوحہ سے آباد نہیں۔ بہرحال اگر اس اصول پر آپ کو اصرار ہے کہ کسی کا لے پالک لفظ "بیٹا" بولتے ہی حقیقی بیٹا بن جائیگا اور اس کی بیوی حقیقی بہو بن جائے گی اور اس متبنی کا باپ اس بہو کا حقیقی خسر بن جائے گا جس سے اس پر یہ بہو ہمیشہ کیلئے حرام ہو جائے گی تو اسی اصول پر یہ بھی آپ کو ماننا چاہیئے کہ حسبِ تصریح بائبل جب کہ دنیا کی تمام عورتوں پر ماں، بہن، بیٹی کے الفاظ بولے جاچکے ہیں تو وہ اسی آن ماں، بہن، بیٹی بن گئیں اس لیئے نہ کسی عورت سے ابتداءً نکاح درست ہوگا جبکہ وہ اِن لفظوں کے نیچے آئی ہوئی تھی اور نہ نکاح ثانی درست ہوگا جب کہ منکوحہ کے علاوہ بتصریح بائبل، سب پہلے ہی سے ماں، بہن، بیٹی بنی ہوئی تھیں،

آپ کے اِس اصول کے اِن مہمل نتائج کو سامنے رکھ کر صاف واضح ہے کہ یہ اصول ہی مہمل اور بے معنی ہے کہ جس پر جو لفظ بولدیا جائے وہ اسی وقت ویسا ہی ہو کر اس لفظ کے حقیقی معنیٰ میں داخل ہو جاتا ہے یہ ساری خرابی اس سے رونما ہوئی کہ لغت کو اصطلاح سمجھ لیا گیا۔ ہاں جو الفاظ حقیقتاً

اصطلاحی ہیں جیسے شریعت کسی لغت کو اپنی اصطلاح ٹھیرا لے مثلاً نکاح طلاق وغیرہ کے الفاظ لغت سے لیکر ان کے شرعی معنی خود شریعت ہی متعین کرے تو اس صورت میں بلاشبہ یہ الفاظ اپنے مواقع پر وہی معنی پیدا کردیں گے جو شریعت نے متعین کر لئے تھے۔ لفظ نکاح آتے ہی واقعی نکاح کے معنی ثابت ہو جائیں گے اور لفظ طلاق کے آتے ہی نکاح ختم ہو جانیکے معنی واقع ہوجائینگے مگر یہ خدائی اصطلاح ہوگی۔ اس سے بندوں کو یہ حق نہیں پہونچیگا کہ وہ اس کے مقرر کردہ الفاظ کو اپنی اصطلاح سمجھ کر خود سے جو چاہیں ان کے معنی بنالیں کیوں کہ اس صورت میں یہ الفاظ لغت شرعی قرار پا جائیں گے اور لغت میں جو خدا کی طرف سے ہوتا ہے کسی کو تصرف کا حق حاصل نہیں اندریں صورت لفظ "بیٹا" کو دیکھا جائے تو وہ خدائی لغت بھی ہے اور خدائی اصطلاح بھی ہے جس کے معنی لغتہً اور شرعاً متعین ہیں۔ بندوں کی طے کی ہوئی کوئی اصطلاح نہیں کہ اس کے معنی اُن کے فرض کر لینے پر بدل سدل جائیں اور لفظ "بیٹا" بول کر غیر بیٹے کو بیٹا فرض کرلیا جائے تو وہ بیٹا ہو جائے اور بیٹے پر اگر غیر "بیٹا" کا لفظ بول دیا جائے تو وہ اسی وقت بیٹا ہونے سے نکل جائے آخر عقلاً بھی یہ کیسے ممکن ہے کہ لفظ "بیٹا" بولتے ہی ایک شخص کی پہلی ابنیت تو ختم ہوجائے اور دوسری اس کی جگہ لیلے یعنی وہ اپنے باپ کا "بیٹا" نہ رہے جس کے نطفہ سے اس نے جنم لیا تھا اور منہ بولا باپ واقعی اس کا باپ بن جائے یعنی یہ اس کے نطفہ سے پیدا شدہ ہو جائے پھر یہ بھی ممکن نہیں کہ محض زبان سے کسی کو بیٹا کہدینے سے وہ حقیقتاً "دوباپو نکا

بیٹا اور دونوں سے الگ الگ پیدا شدہ ہو جائے۔ اگر کوئی خورد کسی بڑی بوڑھی عورت کو ماں کہدے اور وہ اس کہنے پر رضا و خوشی کا اظہار کرے گویا اس لقب کو مان لے تو وہ اسی وقت اس کے پیٹ سے نکلا ہوا ثابت ہو جائے۔ ٹھیک اسیطرح سے پالک بنا لینے سے آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ یا اس کا باپ بدل جائے اور یا وہ بیک وقت دو باپوں کے نطفہ سے پیدا شدہ ہو جائے۔ اگر یہ ضابطہ اسیطرح مان لیا جائے تو حقائق سے امن اٹھ جائے گا ہر شخص اپنی اغراض کی خاطر جو لفظ چاہے بولدیا کرے گا اور اس کے بولتے ہی اس کے واقعی معنی فوراً لفظوں میں حاضر ہو جایا کریں گے ایک شخص اگر کسی نفسانی غرض سے بیٹے کو محروم الارث بنانا چاہے تو وہ کہدے گا کہ یہ میرا بیٹا نہیں تو وہ بیٹا نہیں رہے گا اور کسی اجنبی سے محبت کا علاقہ قائم ہو گیا اور کہدیا کہ یہ میرا بیٹا ہے تو وہ اسی وقت حقیقی بیٹا بنکر شریک وراثت ہو جائیگا اس فرضی اصول کا نتیجہ اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا کہ خدائی اصول ختم ہو جاویں اور انسانوں کی غرض مندیاں الفاظ کا جامہ پہن کر اصول قرار پا جائیں ظاہر ہے کہ اسطرح نہ شرائط کی اہمیت باقی رہے گی اور نہ قوانین الٰہیہ کی کوئی حقیقت۔ صرف لفظی چکر ہوں گے جن کی آڑ میں انسان شتر بے مہار ہو کر رہ جائے گا اس سے انکار نہیں کہ لفظ ابن (بیٹا) کے بولنے پر کہیں اس کے کچھ اخلاقی یا قانونی آثار مرتب ہو جائیں اور شریعت بھی ان کا اعتبار کرے لیکن یہ اس لفظ کے بولنے سے وہ حقیقۃً بیٹے کے

کے درجہ کو پہونچ جائے اور بیٹے ہونے کے احکام اس پر مرتب ہو جائیں غلط اور ہدایت کے خلاف ہے۔

بنیادی وجہ یہی ہے کہ بیٹے کا لفظ اصطلاح نہیں بلکہ لغت ہے جسکی ایک متعینہ حقیقت ہے جو کسی کے فرض کر لینے سے نہیں بنتی بلکہ قدرتی طور پر بنی بنائی ہے خواہ کوئی فرض کرے یا نہ کرے اور لفظ "بیٹا" بولے یا نہ بولے قرآن حکیم نے اس حقیقت کو اسطرح کھول دیا ہے کہ بیٹے ہونے کا تعلق لفظوں سے نہیں بلکہ نسب سے ہے اور نسب کے معنی یہ ہیں کہ یہ بیٹا اپنے باپ کا جز اور اس کے نطفہ سے پیدا شدہ ہے جو آباؤ اجداد سے سلسلہ بہ سلسلہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے یعنی اس کی جزئیت کی یہ نسبت اپنے باپ سے لیکر بواسطہ آباؤ اجداد حضرت آدم علیہ السلام تک پہونچی ہوئی ہے فرضی یا خیالی نہیں بلکہ امر واقعی ہے جو خدا کے کیے ہوئی ہے کسی کے کہدینے سے نہیں ہوئی۔ اب اگر اس حقیقی بیٹے کے بارہ میں دنیا کے سارے لوگ ملکر بھی اس کے بیٹے ہونے کا انکار کر دیں جن میں خود اس کا باپ بھی شامل ہو تب بھی وہ اسکا بیٹا ہونے سے کبھی بھی نہیں نکل سکتا۔ آخر اس جزئیت کو وہ کیسے ختم کر دیگا جو خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اور آدم تک پہونچے ہوئے اس اجزائی سلسلہ کو کیسے کالعدم بنا دیگا جو ہزاروں برس سے سلسلہ وار منتقل ہوتا ہوا اس تک پہونچا جس پر اُس کی کوئی دسترس ہی نہیں تھی۔

ایسے ہی اگر دنیا کے سارے انسان مل کر کسی کے بیٹے کو دوسرے کا بیٹا کہدیں تو وہ اُس دوسرے کا کبھی نہیں بن سکتا جبکہ بیٹا ہونا کسی کے بنانے

نہ بنانے یا ماننے نہ ماننے پر موقوف نہیں بلکہ خلقی نسب اور جزئیت کے تعلق پر موقوف ہے جو محض تخلیق الٰہی سے ممکن ہے افواہ انسانی سے نہیں تو یہ بیگانہ شخص اپنے کو اس فرضی باپ کا جزو کیسے بنائے گا جو خدائی ساخت کا ثمرہ ہے کسی انسانی قدرت کا کرشمہ نہیں۔

قرآن حکیم کی اس محولہ آیت نے جس کے پیش کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا اسی حقیقت کے بارہ میں ذیل کا اعلان فرمایا ہے جس سے باپ اور بیٹے ہونیکے واقعی اور اصلی معنی کھل جاتے ہیں فرمایا۔

ھو الذی خلق من الماء بشرًا	وہ اللہ وہی ہے جس نے پانی سے آدمی
فجعلہ نسبًا و صہرًا وکان	بنایا پھر ٹھیرایا اس کے لیے جدی نسبت اور
ربک قدیرًا (الفرقان)	سسرالی رشتہ اور تیرا پروردگار سب کچھ کر سکتا ہے

اس آیت کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ جس علاقہ سے قرابت یا رشتہ داری قائم ہوتی ہے اور ان قرابتوں پر حسب قرب و بعد ان کے عرفی القاب اور پھر اُن پر آثار و احکام مرتب ہوتے ہیں اور حلال و حرام کا قصہ چلتا ہے اُس کے صرف دو ہی اسباب ہیں ایک نسب اور ایک صہر۔ یعنی سسرالی علاقہ مرد و عورت کے ملنے سے چلتا ہے جس سے مرد کا عرفی لقب باپ ہوتا ہے اور عورت کا عرفی لقب ماں۔ پھر باپ کے علاقہ سے اس کے اصول میں دادا پردادا وغیرہ اور اس کے فروع میں بیٹا پوتا پرپوتا وغیرہ ادھر باپ کے بھائیوں سے چچا تایا کا علاقہ اور ماں باپ شریک اولاد سے حقیقی بہن بھائی اور ان کی اولادوں سے

بھتیجوں بھانجوں کا علاقہ یا فقط باپ شریک اولاد سے علاتی بہن بھائی اور فقط ماں شریک اولاد سے اخیافی بھائی بہن وغیرہ علاقے چلتے ہیں اور اُنپر میراث وغیرہ کے احکام وغیرہ مرتب ہوتے ہیں اسیطرح ماں کے علاقہ سے نانے ماموں سی بھانجہ بھانجی وغیرہ کا علاقہ، ادھر صھری علاقہ سے خسر ساس سالا اور سالی وغیرہ کے رشتے قائم ہوتے ہیں اور انہی کے قرب و بعد کے معیار سے وارثت کے احکام صلہ رحمی کا قانون بنتا ہے جس سے واضح ہے کہ سارے قرابتی رشتوں اور ان کے آثار اور عرفی القاب و اسمار کے لیے سبب صرف یہ دو ہی علاقہ ہیں نسب اور صھر انہی دو علاقوں سے نسل چلتی ہے اور انہی دو سے قرابتی سلسلے دنیا میں پھیلتے ہیں نسبی رشتہ باپ دادا سے چلتا ہے اور سسرالی رشتہ بیوی کے علاقہ سے قائم ہوتا ہے اس بنیاد کو قائم کر کے آیت بالا نے دوسری راہنمائی یہ کی کہ ان دونوں علاقوں کی تخلیق کو حق تعالیٰ کا فعل بتایا کیوں کہ مرد اپنے نسب سے بنے گا جبکہ وہ اپنے ماں باپ کا اور اُن کے اوپر تک سلسلہ وار اُن دونوں کے آباؤ اجداد سب کا جز ہوگا اور ظاہر ہے کہ یہ جز میں سے جز نکالنا یعنی آدمی بنانا اور آدمی میں سے آدمی نکال لینا مخلوق کا کام نہیں ہو سکتا اسیطرح عورت اپنے نسب سے بنے گی وہ اپنے باپ دادا کا جز ہوگی جسے جز در جز کے واسطہ سے اِن اجزار میں سے نکال کر یہاں تک پہنچانا خالص خدا ہی کا فعل ہو سکتا ہے کسی مخلوق کی یہ طاقت نہیں۔

البتہ مرد و عورت کا نکاح کے علاقہ سے باہم جڑنا گو اُن کے ارادہ و

اختیار سے ہوتا ہے اور اس لئے علیحدہ ہو جانا بھی ارادہ و اختیار ہی سے ہوتا ہے جیسے طلاق کہتے ہیں لیکن جب کہ یہ علاقہ بھی خدا کا نام اور واسطہ درمیان میں آئے بغیر قائم ہی نہیں ہوتا اور اس علاقہ کی روح یعنی دو اجنبی دلوں کا بیکدم ایک ہو جانا بھی جس سے یہ علاقہ بقا پذیر رہتا ہے محض خدا ہی کا فعل ہے جس میں کسی مخلوق کا دخل نہیں اس لئے اس سسرالی رشتہ کو بھی فعل خداوندی ہی ظاہر فرمایا گیا۔ پس خاوند بیوی کا وجود تو ہوا تو خدا کے خلق سے اور وہ خاوند بیوی ہوئے خدا کے امر سے نہ کہ محض اپنے ذاتی یا اصطلاحی ربط سے جس کا نام سیول میرج ہے جس کی روح میں پھر خلق خداوندی ہی کارفرما ہوا اس لئے نسب ہو یا صہر جیسی رشتہ ہو یا سسرالی علاقہ دونوں کے دونوں اس آیت سے انسانی تخلیق کا نتیجہ نہیں صرف خدا کے خلق و امر کا اثر ثابت ہوتے ہیں اسی لئے انہیں خلق اور جعل کا لفظ لا کر دونوں کو فعل خداوندی بتلایا گیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ صرف اسی نے بشر بنایا صرف اسی نے اسے نسب کا علاقہ بخشا اور صرف اسی نے اُسے سسرالی علاقہ دیا یہ کسی غیر کا کام نہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ انسان کے افراد الگ الگ بنکر آسمان سے نہیں برس پڑے بلکہ ایک ہی سے ایک بطور جزر کے فعل خداوندی سے نکلتے چلے آئے ہیں جس سے نکلنے والا اپنے اوپر والے کی فرع بنا اور اوپر والا اُس نکلے ہوئے کی اصل ثابت ہوا اسی اصل کو شریعت اور عرف میں باپ اور فرع کو بیٹا کہا جاتا ہے جس سے واضح ہوا کہ ابوّۃ یعنی باپ ہونا اور

ابنیت یعنی بیٹا ہونا مخلوق کے فعل سے نہیں صرف خدا کے فعل سے ہے۔ جس کی تبدیلی بھی مخلوق کے ہاتھ میں نہیں۔ اب اگر خدا کے بنائے ہوتے بیٹے کو ساری مخلوق مل کر بھی غیر بیٹا کہدے یا غیر بیٹے کو جو اس نسبی سلسلہ سے بیٹا نہیں بنا بیٹا کہدے تو نہ وہ بیٹا غیر بیٹا بن سکتا ہے اور نہ یہ غیر بیٹا بیٹا بن سکتا ہے کیوں کہ یہ جزئیت اور بعضیت کا علاقہ جس سے بیٹا بیٹا اور باپ باپ بنتا ہے خدا کے سوا کسی کے بھی ہاتھ میں نہیں پھر بھی اگر کوئی زبردستی بیٹے کو غیر بیٹا اور غیر بیٹے کو بیٹا کہنے لگے تو اس سے حقیقت نہیں بدل سکیگی یہ کہنے والا ہی احمق شمار ہوگا جو ناممکن کو ممکن بنانے کی فکر میں تھا کیوں کہ یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص بلا اپنے اوپر والے کا جزء بنے اس کا بیٹا ہو جائے یا ایک شخص بلا اپنے نیچے والے کا کُل ہوئے اس کا باپ بن جائے کیوں کہ لفظ باپ اور بیٹا اصطلاح نہیں جو فرض کر لینے سے ہو جائے بلکہ لغت اور حقیقت ہے جو خدا کے بنائے بنی ہے جس میں کسی انسان کے فعل اور تخلیق کو دخل نہیں۔ اس لئے قرآن کے اس عقلی نقلی اور حسّی اصول پر موُنھ بولا بیٹا کبھی بیٹا نہیں بن سکتا کہ بولتے ہی اس میں نسب کے سارے علاقے قائم ہو جائیں اور منھ بولا باپ کبھی باپ نہیں بن سکتا کہ بولتے ہی اس سے جزئیت کا علاقہ جُڑ جائے اور یہ دونوں محض نوک زبان کی حرکت سے اسی وقت جزء و کُل کی حیثیت سے جڑ جائیں۔ اس لئے موُنھ بولے بیٹے کی بیوی یعنی موُنھ بولی بہو بھی حقیقی بہو نہیں بن سکتی کہ اُس پر حقیقی بہو کے احکام جاری ہونے لگیں

اور وہ اس بہو کا منہ بولا خسر حقیقی خسر نہیں ہو سکتا کہ اس پر سسرالی رشتہ کے احکام جاری ہوں اور یہ لڑکی اس پر حرام ہو جائے جبکہ اُن علاقوں کا وجود موتھ سے بول دینے سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا بلکہ جز بندی اور کل سازی سے تعلق رکھتا ہے جو خالص خدا کا فعل ہے بندہ کا نہیں ہو سکتا اسلئے اُسے اپنی زبان کا فعل سمجھنا محض ایک افواہی بات ہوگی جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

اسی لئے قرآن نے اس کے بارہ میں فرمایا کہ ہم نے تو ان لے پالکوں کو تمہارا بیٹا بنایا نہیں تم ہی نوک زبان سے انھیں بیٹا کہہ لیتے ہو تو

ذلکم قولکم بافواھکم یہ قول (لے پالک کو حقیقی بیٹا کہدینا) محض تمھارے موتھ کی ہوا اور (افواہی) بات ہے۔

لے پالک یعنی فرضی بیٹے اور اصلی بیٹے کے درمیان حد فاصل یہی آیت کریمہ ہے جس نے بیٹا ہونے کی فطری بنیادوں کو کھول دیا ہے جس کے تحت فرضی بیٹا داخل ہی نہیں ہو سکتا ظاہر ہے کہ جب آیت بالا نے تمام قرابتی رشتوں کو نسب اور صہر میں منحصر کرتے ہوئے ان دونوں کی۔ نسبت حق تعالیٰ کی طرف فرمادی اور لے پالک کا رشتہ نہ اُن دو میں سے کسی میں آتا ہے اور نہ اُس کے بنانے کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے۔ تو کھل گیا کہ لے پالک کوئی رشتہ ہی نہیں اور نہ ہی خدا کا بنایا ہوا ۔ کوئی تعلق ہے جبکہ نہ اُن دو میں وہ داخل ہے اور نہ اللہ نے اور رشتوں کے عرفی اسمار باپ، بیٹا، چچا، خالو وغیرہ کی طرح

اس کے لئے کوئی عرفی لقب تجویز فرمایا تو ثابت ہو گیا کہ یہ ایک عام اخوۃ اور باہمی پیار و شفقت کا علاقہ ہے جس کا شرعی لزوم اور وجوب سے کوئی تعلق نہیں اس لئے اصلی بیٹے کے جو بھی تکوینی یا تشریعی احکام منجانب اللہ متعین ہیں وہ اس فرضی بیٹے پر قدرتاً جاری نہیں ہو سکتے یعنی جس طرح اور رشتوں میں ایک نوع رشتہ کے احکام اور ان کے تعارفی اسماء و القاب الگ الگ متعین ہیں وہ کسی دوسری نوع رشتہ پر لاگو نہیں ہو سکتے۔ ماں کا حکم بیوی پر یا بیوی کا حکم ماں پر نہیں لگ سکتا۔ باپ کا حکم چچا پر اور چچا کا حکم باپ پر نہیں آسکتا بہن کا ماں پر اور ماں کا بہن پر نہیں لگ سکتا اسیطرح بیٹے کا حکم لے پالک پر اور لے پالک کا حکم بیٹے پر کبھی نہیں لگ سکتا۔ اگر ان احکام میں خلط ملط ہو جائے تو یہ اباحیت ہو گی جس سے نظام عالم نظام عمل اور نظام اخلاق سب برباد ہو جائے گا۔

یہی وہ اصل اصول قرآنی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھی جس کی رو سے آپ نے باذن الٰہی جان لیا تھا کہ بیٹا جبکہ لبنی ان مذکورہ نظری اور خلقی بنیادوں کی وجہ سے غیر بیٹا نہیں ہو سکتا اور غیر بیٹا بنام لے پالک بیٹا نہیں ہو سکتا تو اس غیر بیٹے کی بیوی بیٹے کی بیوی نہیں کہلائی جا سکتی جیسا کہ اپنے نسبی بیٹے کی بیوی غیر بیٹے کی بیوی نہیں بن سکتی۔ اسلئے شرعاً نظرۃً اور خلقتاً لے پالک (فرضی اور بناوٹی بیٹے) کی بیوی سے منہ بولے باپ کا نکاح کیا جانا کسی جہت سے بھی قابل اعتراض نہیں ہو سکتا جس کے لئے یہ مذکورہ آیت کریمہ ایک بنیادی قانون بنکر خدا کی طرف سے

آئی جس کا حضرت زید و زینب کے نکاح کے خصوصی واقعہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ ایک اصول ہے جس کے نیچے یہ نکاح بھی آیا ہوا ہے اور دنیا میں جتنے بھی ایسے نکاح ہوں گے وہ اسی آیت کے نیچے آکر جائز اور خاص حالات میں مستحسن شمار ہوں گے۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے لے پالک کی بیوی سے نکاح اسی آیت کے بنیادی قانون کی روشنی میں ہوا تو قرآنی حجت کے تحت ہوا۔ پس نبی کا فعل خود شریعت تھا اسی کے ساتھ قرآن کی روشنی اس میں پہلے سے موجود تھی تو قرآن کا حوالہ دے کر یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لے پالک کی بیوی سے نکاح کرکے سند جواز منگوالی اور فوراً ہی وحی آگئی اور لے پالک کی بیوی سے نکاح کا حق اللہ میاں سے حاصل ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔

نہ صرف قرآن سے بے خبری بلکہ بدبختی ہے کہ دعویٰ محقق اور باخبر ہونے کا کیا کیا جائے اور خدا و رسول پر اور کتب سماوی پر بیجا نا اعتراضات کرنے میں ثبوت جہالت و عناد کا دیا جائے جس کی کم سے کم مدعیان علم و خبر سے توقع نہ ہونی چاہیئے تھی۔

غرض لے پالک کے بارہ میں جتنے شبہات قرآن کے سر رکھ کر کئے گئے تھے ہم نے ان کا تجزیہ کرکے حقیقت حال عرض کر دی ہے جس کے ان شبہات کی بنیاد منہدم ہو جاتی ہے اور ایک منصف انسان کے لیے حق تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ سب جوابات جو قرآنی حوالوں سے عرض کئے گئے حقیقت

یہ ہے کہ ہمارے ذمہ ضروری نہ تھے محض تبرعاً اور اخلاقاً عرض کر دیے گئے ہیں جیساکہ ابتداً تحریر میں وعدہ کر لیا گیا تھا کیوں کہ بے پالک کے مسئلہ کی یہ بحث درحقیقت کسی جزوی مسئلہ کی بحث نہیں جبکہ ہم میں اور معترض صاحب میں نقطۂ نگاہ اور اصول کا فرق ہے جب کہ آپ کتب سماوی اور عقلی ونقلی اصول کو چھوڑ کر اقوام دنیا کے رسم ورواج کو اس مسئلہ کی بنیاد کے طور پر سامنے لا رہے ہیں جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ آپ کے نزدیک رواج شریعت پر حاکم ہو سکتا ہے درصورت تعارض رواج کی خاطر شریعت چھوڑی جا سکتی ہے اور مسلمانوں کے نزدیک شریعت رواج پر حاکم ہے اور بصورت تعارض شریعت کو اختیار کیا جائیگا اور اس معارض رواج کو مٹا دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اصول کا فرق ہوتے ہوئے ہم میں اور آپ میں جزئیات کی بحث قدرتاً باقی نہیں رہتی ہے جو شخص اسلام کے اصول ہی تسلیم نہیں کرتا اُسے اسلام کی جزئیات کی بحث میں پڑنا در بحث چھیڑنے کا اصولاً حق ہی نہیں پہونچتا اور جو شخص قرآن ہی کو نہیں مانتا اس کے لئے قرآنی مسائل میں الجھنے کا کوئی موقع ہی نہیں رہتا وہ پہلے اصول طے کرے پھر جزئیات کے میدان میں آئے۔ بلکہ اسے سب سے پہلے اصول ہی کا سوال اٹھا کر انہیں صاف کر لینا چاہیئے تاکہ جزوی مباحث کے وقت فریقین کا کوئی مسلم معیار سامنے رہے جس کی طرف وہ اختلاف کے وقت بحیثیت حکم کے رجوع کر سکیں معیار بحث طے کرنے سے قبل جزئیات کی بحثیں اس لئے لایعنی اور بے فائدہ ہیں کہ جزئیات اپنے اُصول کے

تابع ہوتی ہیں خود ان کا اپنا وجود کچھ نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اصول کے سہارے قائم اور باوجود رہتی ہیں جب اصول ہی سامنے نہیں تو جزئیات کالعدم ہیں اور ایسی صورت میں اُن کی بحث گویا عدم پر بحث ہوتی ہے وجود پر نہیں یا بعنوانِ دیگر خیالی بحث ہوتی ہے واقعی نہیں جس کا کوئی نتیجہ نہیں اسلئے آپ سے اگر اصولاً گفتگو آسکتی ہے تو صرف اس مسئلہ میں کہ رواج اصل ہے یا شریعت الٰہی اصل ہے نہ کہ اس میں کہ پیغمبر یا امتّوں میں سے کسی کا اپنے لے پالک کی بیوی سے نکاح کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ کیوں کہ آپ اس مسئلہ میں بطور حجّت کے رواج کو پیش کریں گے اور ہم صرف شریعت کو تو بحث قدرتاً یہ آجائے گی کہ درصورت تعارض ان میں سے بنیادی حجّت کونسی ہے جس سے مسئلہ کا فیصلہ کیا جائے۔ اور اُن میں سے رواج کی کیا حیثیت ہے اور شریعت کی کیا؟ ظاہر ہے کہ جب دلائل اور حجتّوں ہی میں اختلاف و نزاع قائم ہو جائے تو جزئیات مسائل کی بحث جو ان حجتّوں کے آثار ہیں قدرتاً مؤخر ہو جائے گی اور اصل نہ رہیگی۔

نیز آپ کی ساتھ اِس بارہ میں بحث کا دوسرا مقام یہ ہوگا کہ نسب اور باپ بیٹا بننے کا تعلّق انسان کی زبانی حرکت سے ہے کہ وہ جس اجنبی کو بھی بیٹا کہدے وہ بیٹا ہو جائے اور اُس کے سابق نسبی رشتے منقطع ہوتے چلے جائیں اور لے پالک کے بعد کے نئے رشتے جڑتے چلے جائیں اور جس واقعی بیٹے کے بیٹا ہونے کا کوئی انکار کردے کہ وہ میرا بیٹا نہیں تو وہ بیٹا نہ رہے اور نسب کے سارے علاقے منقطع ہوتے چلے جائیں

گویا اب اس بیٹے کی اولاد یعنی پوتے اپنے دادا کے پوتے باقی نہ رہیں اور اس بیٹے کی بیوی اس کی بہو نہ رہے اس سے نکاح جائز ہو جائے۔ نیز وہ میراث کا مستحق باقی نہ رہے اور نہ اس کے ذریعہ سے جو رحم کے رشتے قائم ہوئے تھے وہ قائم رہیں بلکہ یہ سارے نسبی اور وراثتی سلسلے اس کی یک نوک زبان سے یک قلم ختم ہو جائیں اس لئے بحث یہ ہوگی کہ آیا بیٹے ہونے کا تعلق نوک زبان اور افواہ سے ہے یا یہ علاقے خدا کی تخلیق اور جزو بندی سے قائم ہوتے ہیں جنہیں قائم ہو جانے کے بعد نہ کوئی مٹا سکتا ہے اور نہ قائم ہونے سے قبل کوئی قائم کر سکتا ہے۔

نیز تیسری اصولی بحث اس میں یہ ہوگی کہ آیا لفظ بیٹا اور بیٹا ہونا کوئی اصطلاحی بات ہے جو محض فرض کر لینے اور محض لفظ بول دینے پر مبنی ہے یا کوئی حقیقت ہے جس کی بنا انسان کے فرض و تخیل اور لفظ و کلام سے بالاتر ہے۔

اور چوتھی بحث یہ ہوگی کہ منسوخ شریعت سے ناسخ شریعت کے مقابلہ میں استدلال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ہمارے نزدیک کسی بھی منسوخ شدہ شریعت سے بمقابلہ ناسخ استدلال جائز نہیں ہوگا اور آپ اسلام کی ناسخ شریعت کے مقابلہ میں انجیل لے آئیں گی جو منسوخ شریعت ہے اور اس کے احکام صرف اس حد تک تسلیم کئے جا سکتے ہیں جس حد تک قرآن انہیں برقرار رکھے جو اس دنیا کی آخری کتاب اور آخری نبوت کی یادگار ہے۔

جب یہ چاروں اصول طے ہو جائیں گے تب اس میں گفتگو آ سکتی ہے

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی مطلقہ بیوی سے یہ نکاح کیسا تھا جائز تھا یا ناجائز۔ بالفاظ دیگر آپ سے اختلاف دعویٰ میں نہیں بلکہ دلیل میں ہے دلائل کی نوعیت متعین ہو تو مسائل کی بحث اور فیصلہ کا مقام آئے۔ اس پر بھی میرا آپ کو اس جزئی مسئلہ میں مخاطب بنا لینا اور دعویٰ ہی میں گفتگو شروع کر کے جواب عرض کرنا اور وہ بھی اسقدر تفصیل کے ساتھ اور وہ بھی قرآن سے وہی اخلاقی بات اور محض آپ کی خاطرداری ہے ورنہ اصولاً آپ کو ان مسائل میں قبل از تصفیۂ اصول مجھ سے گفتگو کا حق نہیں۔

اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات کی نوعیت عموماً یہی ہوتی ہے کہ وہ جزئیات کو سامنے لاکر اعتراضات شروع کر دیتے ہیں نہ انہیں اصول کی خبر ہوتی ہے نہ قواعد و دلائل کی۔ اس لئے اصولاً وہ اعتراضات بے اصول اور ناقابل التفات ہوتے ہیں عقلی اور اصولی چیز کا صرف یہی ہے کہ آدمی اگر کسی دین کے اصول ہی سے مختلف ہے۔ تو وہ اسکی فروعی مباحث نہ چھیڑے۔ بلکہ اصول کا اعتراض کر کے پہلے اس کا جواب لے۔ اگر اس سے شفا ہو جائے تو فروعی اعتراضات کا جواب خود ہی اُسکے ذیل میں ہو جائے گا کیونکہ فروعی جزئیات اپنے اصول ہی کے سہارے ٹھیری رہتی ہیں جب اصول سمجھ میں آجائے تو جزئیات اپنے آپ ہی۔ بلا اعتراض سمجھ میں آجائیں گی۔ ہاں اصول کے بارہ میں شفا نہ ہو تو۔ اصول کا اختلاف باقی رہتے ہوئے فروعی جزئیات پر اعتراض کا مقام

ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اُن کی بحث چھیڑی جائے اور آدمی ایک بے جوڑ کے درخت کی آبیاری کی بے نتیجہ محنت اپنے سر لے۔ بہر دو صورت غیر مسلم کیلئے فروعی جزئیات کی بحثیں چھیڑنے کا کوئی بھی موقعہ اصولاً نہیں آتا۔ پھر بھی چھیڑا ہی جائے تو اُسے چھیڑنا نہیں چھیڑ اٹھانا کہا جائے گا جس کا حاصل کسی مذہب کو مطعون دکھلا کر اُس کے خلاف اشتعال پیدا کرنا یا اپنے دل کی بھڑاس نکالنا ہوتا ہے جو ایک انصاف پسند اور حق طلب آدمی کا کام نہیں ہونا چاہیئے۔

بہرحال لے پالک اور موتھ بولے بیٹے کا مسئلہ جزوی مسئلہ ہے جس کا اصولی فلسفہ اور بنیادی حقیقت میں نے عرض کر دی کہ وہ ایک عنوانِ شفقت ہے نہ کہ حقیقی ابنیت" اس لئے آپ یہ لے پالک کی ابنیت کا مسئلہ واپس لے لیں اس وجہ سے بھی کہ اصولاً اس کا چھیڑنا بے محل ہے اور اس لئے بھی کہ بہرحال اس کے بارہ میں اعتراضات کا مکمل جواب آپ کے سامنے آچکا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں آپ کا بھی کچھ قصور نہیں کہ آپنے موتھ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹا بنا دینا ہی اصول سمجھ رکھا ہے۔ کیوں کہ موجودہ عیسائیت کی بنیاد ہی اس اصول پر ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو مشفقانہ الفاظ سے خدا کا موتھ بولا بیٹا دیکھکر جو ظاہر ہے کہ شان شفقت ہی سے ہو سکتا ہے اگر ہوا ہے تو اُن کے حقیقی بیٹے ہونیکا تصور باندھ لیا جائے اور اُن کا نسب مخلوق سے کاٹ کر محض لفظ ابن اللہ آجانے سے (اگر وہ انجیل میں کہا گیا ہے) اللہ سے جوڑ دیا جائے۔

ہو سکتا ہے کہ بائبل میں لفظ ابن اللہ آیا ہو اور اللہ ہی نے فرمایا ہو

مگر اسی طرح جس طرح ایک شفیق بزرگ اپنے کسی چھوٹے کو بیٹا کہکر پکارتا ہے بلکہ خاندانوں میں عموماً بڑے بوڑھے ہر بچّہ کو بیٹا کہکر خطاب کیا کرتے ہیں جن کے ذہنوں میں نسب جوڑنے کا تخیل تک نہیں ہوتا۔ یا جیسے کسی علاقہ کا رئیس اپنی رعایا کے لوگوں کو اپنا بچّہ اور اولاد کہتا ہے اور یہ رعایا اپنے رئیس کو اپنا مائی باپ کہکر پکارتی ہے جس میں نسبی رشتہ ناطہ کا کوئی ادنیٰ تصوّر تک ذہنوں میں نہیں ہوتا بلکہ چھوٹوں کی طرف سے باپ کا لفظ بطور اظہار عظمت و جلالت اور بڑوں کی طرف سے بیٹے کا لفظ بطور اظہارِ شفقت و محبّت کے استعمال کیا جاتا ہے۔ عرب ممالک میں عموماً کم عمر لوگ اپنے معمّر بزرگوں کو تعظیماً ابُوی (میرے باپ) کہکر پکارتے ہیں درحالیکہ ان میں باہم باپ بیٹے کا علاقہ تو کیا ہوتا سرے سے کوئی نسبی اشتراک تک نہیں ہوتا خود شریعت اسلام میں بھی خدا کی ساری مخلوق کو اللہ کا کنبہ کہا گیا ہے حدیث نبوی میں ہے۔

اَلخلقُ عیالُ اللہ — ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے

لیکن نہ بایں معنیٰ کہ خدا کی رشتہ داریاں اور کنبہ داری مخلوق سے قائم ہے یا لوگ حقیقتاً اس کے نسبی بھائی بھتیجے اور بھانجے بیٹے ہوتے ہیں۔ معاذ اللہ کہاں مخلوق اور کہاں خالق وہ نور مطلق اور مخلوق اپنی ذات سے ظلمت محض "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" بلکہ شدّت تعلق اور غایت شفقت ظاہر کرنے کے لئے یہ عنوانات اختیار کئے جاتے ہیں نہ کہ خاندانی اور نسبی علاقے باور کرانے کے لئے جن کی عرفی وجہ یہی

ہوتی ہے کہ بنی نوع انسان میں اس انتہائی شفقت کو نمایاں کرنے اور پہنچوانے کے لئے اس سے زیادہ بلیغ اور باادب عنوان دوسرا نہیں کہ اُسے بیٹا پکار دیا جائے یا جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث پاک میں اپنے کو اُمّت کے حق میں باپ فرمایا کہ

انا لکم بمنزلۃ الوالد — میں تمہارے حق میں بمنزلہ باپ کے ہوں

اور قرآن کریم میں آپ کی ازواج مطہرات کو ساری امّت کے لوگوں کی مائیں فرمایا۔

وازواجہٗ امہاتھم — اور نبی کی بیویاں (امت کے) لوگوں کی مائیں ہیں

لیکن نہ بایں معنیٰ کہ ترک و تتار ایشین اور یورپین افریقن اور امریکن قوموں کے نسبی رشتے آپ کی ذات بابرکات سے قائم مانے جائیں اور ان عنوانات پر بھائی بھتیجوں اور بہن بھانجوں کی رشتہ داریوں کے حقوق واحکام جاری کئے جائیں لیکن صرف بایں معنیٰ کہ جیسے باپ بہرحال اولاد کی اصل ہونے کی وجہ سے اُن سے ارفع و اعلیٰ اور اُن کے حق میں واجب الاطاعت ہوتا ہے کہ اس کے سامنے اُف تک کرنے کی اجازت نہیں، ایسے ہی رسول امت کی ایمانی اصل ہونیکی وجہ سے ماں باپ سے بھی زیادہ واجب الاحترام اور مفروض الطاعت ہوتا ہے کہ شرعیات میں اس کے سامنے اُف تک کرنے کی اجازت نہیں نہ یہ کہ نبی کو لوگ باپ دادا اور چچا تایا کہہ کر پکارنے لگیں کہ اس صورت میں وہ واجب التعزیر ہوں گے۔ پس جس طرح اللہ نے اپنی ساری خلقت کو اپنی عیال فرمایا

اور جس طرح نبی نے اپنی امت کو اپنی اولاد فرمایا اور جس طرح دنیا اور باً بڑوں کو مائی باپ کہکر پکارتی ہے اور جس طرح نبی کی پاک بیویوں کو امت کی مائیں کہا گیا اسیطرح ممکن ہے کہ انجیل میں کسی موقعہ پر حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی حق تعالیٰ نے شفقتاً بیٹا اور حضرت مسیح علیہ السلام نے حق تعالیٰ کو تعظیماً باپ کہہ کر پکار دیا ہو مگر جس طرح رسول کو امت کا باپ کہنے سے رسول کی امت لے پالک بن کر ان کی نسبی اولاد ثابت نہیں ہو سکتی اور جس طرح رسول کی ازواج مطہرات کو امت کی مائیں کہنے سے وہ امت کی رحمی رشتہ کی مائیں نہیں بن سکتیں اور جس طرح بڑے بوڑھوں کا اپنے خوردوں کو اپنا بچہ اور اولاد کہنے سے وہ ان کے نسبی بچے ثابت نہیں ہو سکتے اور جس طرح مخلوق خدا کے عیال اللہ کہنے سے وہ اللہ کی نسبی اولاد ثابت نہیں ہو سکتی۔ ایسے ہی حضرت مسیح کو ابن اللہ کہنے سے وہ اللہ کے نسبی بیٹے ثابت نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس کے باوجود عیسائیوں نے اس موتھ بولے بیٹے کو واقعی بیٹا فرض کر لیا اور بیٹے ہونے کے سارے ہی احکام ان پر اور باپ ہونے کے سارے ہی احکام اللہ پر جاری کر دیے حتیٰ کہ باپ بیٹے کے درمیان واسطہ ابنیت چونکہ ماں ہوتی ہے تو حضرت مریم پاک کو اللہ کی بیوی تک کہنے سے نہ چوکے تو اس ذہنیت کی وجہ سے واقعی آپ بھی مجبور تھے اگر آپ نے لے پالک اور موتھ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹا سمجھ لیا اور اس پر وہ سارے ہی احکام جاری کر دیے جائیں جو نسبی بیٹے پر جاری ہوتے ہیں کیونکہ آپ کے موجودہ مذہب کی بنیاد ہی اس

موئنھ بولے کلمہ اور فرضیات پر قائم ہے جن میں معنی اور حقیقت کچھ بھی نہیں الحاصل جبکہ آپ کا بنیادی اصول یہ ہو کہ لفظ بیٹا لغت نہیں اصطلاح ہے اور اُس کے زبان سے نکلتے ہی ایک غیر بیٹا اُسی وقت حقیقی بیٹا بن جاتا ہے اور ہمارے نزدیک یہ اصول ایک مضحکہ خیز چیز ہے تو اُس اصولی اختلاف کے ہوتے ہوئے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لے پالک (حضرت زید) کی مطلّقہ (حضرت زینب رضی اللہ عنہا) سے حضور کے نکاح کے بارہ میں آپ کے اعتراضات کی جزئیاتی جوابدہی میرے ذمہ عائد ہی نہیں ہوتی اور جس حد تک اصولی جوابدہی کا تعلق ہے وہ قرآنی ہدایات اور حسّی مشاہدات سے ابھی عرض کیجا چکی ہے اور واضح کیا جاچکا ہے کہ لے پالک محض ایک اخلاقی علاقہ ہے نسبی رشتہ سے اس کا ذرہ برابر تعلق نہیں کہ نسبی احکام اس پر جاری کئے جاسکیں یا حضور کا نکاح حضرت زینب سے کوئی قابل اعتراض فعل ثابت ہو۔

اندریں صورت جبکہ آپ کے نزدیک لے پالک کی متروکہ بیوی سے نکاح کا جائز ہونا۔ ایک طرف تو اس لچر اور بوچ رواج پر مبنی ہو کہ "لے پالک زبان ہلاتے ہی حقیقی بیٹے کے درجہ کو پہونچ جاتا ہے" اور دوسری طرف اس عقلی وفطری بلکہ حسّی اصول سے کٹ کر مخالف سمت میں جا رہا ہو کہ "لے پالک عقلاً وشرعاً حقیقی بیٹا نہیں بن سکتا" تو آپ خود ہی بتلائیں کہ کھلے مندوں کسی معقول ومنقول اور فطری اصول کی بلا دلیل مخالفت کرنا اور غیر معقول غیر فطری اور غلط اصول یعنی رسم ورواج کو اس کے مقابلہ میں بطور اصول

پیش کرنا اور اس پر جمنا کہاں کی دانشمندی دینداری روحانیت اور سچائی ہے؟ اور کیا واقعی اس بے اصول اور بے بنیاد مسلک کے بھاری اور غلیظ پردوں سے ساری دینداری روحانیت اور سچائی چھپ کر نہیں رہجائیگی جبکہ حلال حرام اور حرام حلال ہو جائیگا اور دنیا اس بے دینی کی انارکی میں مبتلا ہو کر دین غیر دین کا فرق مٹا بیٹھے گی۔

تیسرا اعتراض

(اسلام بدکاری سے نہیں روکتا)

آپ نے تیسرا اعتراض اسلام کے معیار اخلاق پر یہ کیا ہے کہ معاذ اللہ اس نے بدکاریوں کو روکنے کے بجائے اور ان کا دروازہ کھول دیا ہے بچنا اگر بتلایا ہے تو صرف شرک سے جس کا مطلب یہ ہے کہ شرک نہ کرو باقی جو چاہو سو کرتے رہو اس بارہ میں آپ کی عبارت حسب ذیل ہے۔

اگر ہم صحیح بخاری پارہ تیرہ کتاب بدء الخلق صفحہ ۱۶ کو پڑھیں تو ہم کو مندرجہ بالا قرآنی وحی کا پوری طرح پر بھید معلوم ہو جاتا ہے وہ یہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جبریل نے مجھ سے کہا تھا تمہاری امت میں جو کوئی اس میں مرے کہ شرک نہ کرتا ہو وہ بہشت میں جاوے گا یا یوں فرمایا دوزخ میں نہ جاوے گا ابوذر نے کہا اگرچہ وہ زنا کرتا ہو اور چوری کرتا ہو؟ آپ نے (محمد صاحب نے) فرمایا گو وہ زنا اور چوری کرتا ہو کیا یہی ہے

قرآنی اور اخلاقی معیار؟

مندرجہ بالا بیان سے تو یہ ثابت ہو گیا کہ جتنی بدکاری چاہو کرو لیکن صرف ایک بات مانتے رہو کہ اللہ لاشریک ہے اللہ بڑا مہربان ہے اور معاف کرنے والا اور بخشنے والا۔

لیکن قرآنی اس تعلیم کے خلاف بائبل کا فرمان ہے کہ نہ حرامکار خدا کی بادشاہی کے وارث ہوں گے نہ بت پرست نہ زناکار نہ عیاش نہ لونڈے باز نہ چور نہ لالچی نہ شرابی نہ گالیاں بکنے والا اور نہ ظالم" (پہلا کرنتھیوں ۶)

آپ نے قرآنی وحی بظاہر لے پالک کی متروکہ بیوی سے نکاح کے جواز کا بھید حدیث ابوذر غفاری سے یہ معلوم فرمایا کہ اس حدیث میں بقول آپ کے زنا وچوری وغیرہ کے جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے اور لے پالک کی متروکہ بیوی سے نکاح کو آپ نے اپنی تحریر میں زنا قرار دیا ہے تو جب یہ معلوم ہو جائیگا حاصل آپ کے زعم کے مطابق یہ نکلا کہ معاذاللہ ثم معاذ اللہ پیغمبر اپنے لیپالک کی متروکہ بیوی سے نکاح کر کے خود بھی زنا کے مرتکب ہوئے اور ادھر امت کے لیے بھی بقول آپ کے اس حدیث میں زنا حلال قرار دیا تو اس طرح قرآنی آیت کا راز حدیث سے کھل گیا یعنی زنا کرنے کرانے کا راستہ خوب کھل گیا۔ استغفراللہ نقل کفر کفر نہ باشد

میں عرض کردوں گا کہ لے پالک کے بارہ میں تو آپ نے جو جو کمزور اور بے جان سہارے پکڑ کر اسے زنا قرار دینے کی لاحاصل سعی کی تھی صفحات بالا میں اس جعلسازی کی قلعی تو پوری طرح کھل چکی ہے اس لئے اس پر

رکھ کر جو راز سربستہ اور انوکھے بھید کی عمارت آپ کے "صاف" ذہن میں کھڑی ہوئی ہو وہ ممکن ہے کہ آپ کے ذہن میں اب بھی کھڑی ہو لیکن عقل و نقل کی سطح پر اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا اس لیے بھید اور سربستہ راز کا قصہ جو محض آپ کے ذہن کا گھڑا ہوا ایک افسانہ ہے وہ آپ جانیں اور آپ کا ذہن جہاں تک الفاظ سے حجت پکڑنے کا سوال ہے سو اب صرف حدیث ابوذر رہ جاتی ہے جس کے لفظوں سے آپ نے اپنے ذہن کے کچھ عجائبات کھولتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ اسلام نے اس حدیث کی رو سے گناہگاریوں کے فروغ پانے کا دروازہ کھول دیا ہے۔

اگر تھوڑی دیر کے لیے اس غلط الزام کو صحیح بھی فرض کر لیا جائے تب بھی کم از کم آپ کو تو اسلام پر اُس اعتراض کا کوئی حق نہیں پہونچتا جبکہ آپ خود بھی مذہباً اسی الزام میں گرفتار ہیں کیوں کہ بقول آپ کے اگر حدیث ابوذر نے زنا چوری اور بدعملی کی اجازت یہ کہکر دیدی ہے کہ بس عقیدۂ توحید و رسالت کے قائل رہو یعنی شرک نہ کرو اور جو چاہو کرو۔ اللہ غفور و رحیم ہے تو عیسائی مذہب نے کفارہ کا عقیدہ سامنے رکھکر عیسائیوں کیلئے سب گناہگاریوں کے دروازے چوپٹ کھولدیئے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ گناہ گار عیسائیوں کے بدلے حضرت مسیح علیہ السلام کو تین دن جہنم میں ڈال کر سزا دیدی جائیگی جس سے امت کے سارے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا اُسے گناہ کرنے میں کسی فکر کرنیکی

ضرورت نہیں اور یہ امت باوجود اپنی ساری بدکاری حرامکاری بت پرستی زناکاری عیاشی چوری لالچ شراب خواری کبر و نخوت گالم گلوچ اور اور ظلم دستم وغیرہ کے صاف بچ جائے گی اور جنت میں جا داخل ہوگی پس اگر حدیث ابوذر میں توحید کے عقیدہ کے ہوتے ہوئے امت مسلمہ کی ساری بدکاریاں محو ہو جائیں گی جو بقول جناب کے بدکاریوں کا دروازہ کھولدیئے جانے کے ہم معنیٰ ہے تو عیسائیت کے اصول پر عقیدہ کفارہ کے ہوتے ہوئے عیسائی امت کی ساری بدکاریاں محو ہو جائیں گی جس کے معنیٰ اس کے سوا اور کیا ہیں کہ عیسائی امت کے لیئے بدعملیوں کا دروازہ کھولدیا گیا ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ پس پیغمبر کو جہنم رسید جاتے ہیں جنہیں معاذ اللہ جہنم میں جھونک کر قوم کی ساری بدفعلیوں کا کفارہ کردیا جائے گا۔

اگر خدا کے رحم و کرم کا انکار کر کے جس کی تعلیم اسلام نے دی تھی عیسائیوں نے عدل کا عقیدہ قائم بھی کیا تو وہ بھی ظلم سے بدتر بنا کر۔ آخر یہ کونسی قسم کا عدل ہے کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ اور وہ بھی پیغمبر معصوم یہ عدل ہے یا انتہائی ظلم؟ تو خدا کی رحیمی و کریمی سے منھ موڑ کر اگر نام کی عدل اختیار بھی کیا تو انتہائی ظلم دستم کا عقیدہ۔ جس سے بارگاہ خداوندی بھی پاک اور بارگاہ نبوت عیسوی بھی بلاشبہ پاک ہے اس لیئے نہ آپ خدا کی صفت رحمت کے قائل رہے نہ صفت عدل کے اور مسلمانوں نے اگر بقول جناب گناہوں کا دروازہ بھی کھولا تو خدا کے رحم و کرم کے بھروسہ پر نہ کہ ظلم و تعدی

کا سہارا لیکر جو خدا کی جناب کے لئے سزاوار ہے نہ پیغمبر معصوم حضرت مسیح پاک کے شایان شان۔

پس اگر عیسائیوں کو گناہوں کا دروازہ ہی کھولنا تھا تو اس سے تو مسلمانوں کی طرح خدا کی رحیمی و کریمی ہی کا نام لیکر کھولتے جس میں کسی پر خدا کی طرف سے ظلم تو لازم نہ آتا زیادہ سے زیادہ یہ لازم آتا کہ خدا نے گناہگاروں کو معاف کر دیا تو یہ کوئی تعدی یا زیادتی نہ تھی جو بارگاہ خداوندی کے سزاوار نہ ہوتی جبکہ بندوں کے نزدیک بھی مجرموں کو معاف کر دینا اور سزا سے درگذر کرنا عقل و فطرت کی رُو سے پاکیزہ ہی صفت سمجھی گئی ہے۔ لیکن میں اس باریک الزامی فرق پر زور دینا نہیں چاہتا کہ بفرض محال گناہوں کا دروازہ خدا کے رحم و کرم کے بھروسہ کھل جانا اتنا برا نہیں جتنا کہ معاذ اللہ اس کے ظلم و ستم یعنی کفارہ کا سہارا لیکر کھل جانا برا ہے۔ کیونکہ اس فرق کو شاید آپ کی عقل برداشت نہ کر سکے کہنا صرف یہ ہے کہ بقول آپ کے اسلام نے شرک سے بچاؤ کا پردہ رکھ کر بدفعلیوں کا دروازہ کھول دیا ہے تو عیسائیت نے کفارہ کا پردہ رکھکر اس سے زیادہ سیہ کاریوں کا دروازہ کھول دیا ہے پھر عیسائیت کے وکلاء کو اس بارہ میں اسلام پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ جس بلا میں وہ خود گرفتار ہیں انہیں دوسرے کی بلا آخر بلا کیوں نظر نہیں آرہی ہے؟ خلاصہ یہ ہے کہ جو اعتراض آپ اسلام پر کر رہے تھے وہ آپ ہی کی گردن کا ہار ہے۔ اس لئے اسلام کو اس بارہ میں

کسی جوابدہی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

ساتھ ہی میں اس پر بھی حیرت کئے بغیر نہیں رہوں گا کہ حدیث ابوذر سے یہ الزام تراشتے ہوئے کہ اسلام نے اس حدیث سے قتل وغارت چوری وزنا وغیرہ کے دروازے کھولدیئے ہیں آپ کے سامنے وہ بیسیوں حدیثیں اور آیتیں نہ آئیں یا آئی ہوں تو آپ نے اُس وقت آنکھ بیچ لی ہو جن میں اِن بدکاریوں کی سزائیں اسلام نے تجویز کرکے بدکاریوں کے دروازے دنیا پر بند کئے ہیں اور جنکی وجہ سے دوسری قوموں کے لحاظ سے کہیں زیادہ اِن جرائم سے پاک وصاف ہے اور اب بھی ہیں کہ۔ چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ زنا کرنے والیکو پتھروں سے سنگسار کردیا جائے۔ شراب خوار کو اسی کوڑے مارے جائیں اور۔ قطاع الطریق ڈاکوؤں کی گردنیں اڑا دی جائیں وغیرہ جن کی بدولت اسلام آنے کے بعد زمانہ جاہلیت کی یہ بدعادتیں جو اُن میں پشتہا پشت سے چلی آرہی تھیں یکسر مٹ گئیں اور ایک ایسا عفت وپاکدامنی کا اجتماعی دور شروع ہوا جس کی نظیر نہ دنیا کی اگلی امتوں میں پائی جاتی ہے نہ۔ پچھلی اقوام میں۔ جس کی شہادت بیت المقدس کی فتح کے وقت خود بیت المقدس کے عیسائیوں نے دی اور صحابہ کی پاکدامنی کا کھلا اعتراف کیا جس کی شہادت ایران کے کمانڈروں نے دی جب مسلمانِ ایران فتح کرنے گئے۔ اور اُن کی پاکدامنی کا ظہور ہوا جسکی شہادت چینیوں نے دی جب صحابہ وہاں تجارت کی لائن سے پہونچے اور معاملات ومعاشرہ

کی سچائی دکھلائی جس کی شہادت ہندوستان کے ہندو راجاؤں اور پرجاؤں نے دی جب مسلمان محمد بن قاسم کی زیر سرکردگی سندھ میں داخل ہوئے اور اپنی پاکدامنی دکھلائی جس سے ہزاروں آدمی اُن کے منوّر چہرے دیکھ کر مسلمان ہوئے اور آج بھی اگر اِن بدعملیوں کے معیار سے مسلمانوں اور عیسائیوں کا مقابلہ کیا جائے تو یورپ و ایشیا کے اخبارات شاید مسلمانوں سے زیادہ عیسائیوں ہی کے مجرم ہونے کی شہادت دیں گے جس سے قومی مزاجوں کا اندازہ ہو سکتا ہے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا تو یہ مزاج قرآنی تعلیمات سے بنا ہے۔ عیسائیوں کے مزاج بننے کا منشا آپ بہتر جانتے ہوں گے مسلمانوں کے عقیدہ میں تو نہ خدا کسی کا باپ ہے کہ اُسے بیوی کی ضرورت پڑے اور عورت کی خواہش نہ رسولِ پاک خدا کا بیٹا ہے کہ وہ اس کی زناشوئی کا نتیجہ ہو۔ نہ خدا کا رسول کفارہ اور فدیہ ہو سکتا ہے کہ امّت سیہ کاری میں آزاد نہ خدا سزا دینے پر مجبور ہے کہ رحم و کرم سے کسی کو معاف نہ کر سکے جبکہ وہ ہر چیز پر غالب اور جابر و قاہر ہے نہ کہ مجبور و مقہور نہ اس کی حکمت میں قصور ہے کہ گناہ کوئی کرے اور وہ بھگتائے کسی بیگناہ کو غرض مسلمان نہ خدا کو جنسی میلان کا شکار جانتے ہیں نہ رسول کو قوم کی شہوات کا بار بردار سمجھتے ہیں بلکہ صاف عقیدہ یہ رکھتے ہیں کہ خدا ہر عیب سے پاک بری مقدّس اور منزّہ ہے اُس کے سارے رسول اِن خرافات کی ذمہ داریوں سے بری ہیں تو ایسے خدا و رسول کے ماننے والے بھی جب تک اسکے دین پر

چلیں گے بد عملیوں کے عقیدت اور مزاج سے بری ہی رہیں گے اور جو ان عقائد کی ضد ملتے ہوں گے ان کا مزاج ویسا ہی رہے گا جیسے یہ عقیدے ہیں۔

بہرحال آپ حدیث ابوذر سے جو کچھ بھی اس مذکورہ تاریخ اور دینی مزاج کے برخلاف سمجھے ہوں وہ تو آپ کا فعل رہا حیرت اس پر ہے کہ اسلامی کردار و اخلاق اور اسلامی دور میں بد عملیوں کے دروازے بند کرنے بلکہ اکھاڑ پھینکنے کی ان میں سے ایک روایت بھی جناب ملاحظہ نہ فرما سکے اور نہ تاریخ کا کوئی صفحہ ہی دیکھ سکے لے دے کر نظر پڑی تو حدیث ابوذر پر اور اس کے بھی اس بناوٹی مفہوم پر جو جناب ہی کا تراشیدہ ہے۔ اسی دیانت داری کہا جائے یا کوئی اور لقب دیا جائے؟ جہانتک حدیث ابوذر غفاری کے واقعی مفہوم کا تعلق ہے جسے دوسری حدیثوں اور محدثوں نے واضح کر دیا ہے میں چاہتا ہوں کہ اب اُسے بھی آپ کے سامنے کھول کر بیان کر دوں تاکہ واضح ہو جائے کہ آپ نے اس کے مفہوم اور مقصد میں کہاں تک کتر بیونت سے کام لیا ہے اور شوق اعتراض میں لوگوں کے بیان کردہ مفہوم سے یکسر قطع نظر کر لی ہے جن کے دین کی وہ روایت ہے اور جنھوں نے اس کے مطلب کی تعلیم سلسلہ بہ سلسلہ خود اپنے پیغمبر سے پائی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حدیث ابوذر جواز معصیت کیلئے نہیں آئی بلکہ ایمان کی خاصیت بتلانے کے لئے آئی ہے کہ وہ نجات ہے اور اس میں معصیت حارج نہیں ہو سکتی خواہ نجات کو موخر بھی ہونا پڑے اور عذاب بھگت کر آدمی کو نجات ملے مگر ملیگی ضرور بس اس حدیث کا منشا صرف ایمان کا

اثر بتلانا ہے کہ وہ نجات ہے خواہ اولاً نمایاں ہو جائے یا بدیر ظاہر ہو اس سے معصیت کا جواز نکالنا یا زنا چوری وغیرہ گناہوں پر ایمان کے ہوتے ہوئے کسی مؤاخذہ کا نہ ہونا اس حدیث کا مفہوم ہے نہ منشا ایسے غلط مفہوم کو حدیث کے سر تھوپنا آپ ہی جیسے جبری حضرات کا کام ہو سکتا ہے ورنہ مسلمان اور موحّد رہتے ہوئے زنا چوری قتل وغیرہ کے مرتکب کو دنیا و آخرت میں سزائے دیئے جانے کی صراحت دوسری احادیث میں صاف صاف بیان کی گئی ہے کہ بہت سے لوگ ہزاراں ہزار برس جہنم کا عذاب بھگت کر جنت میں داخل ہوں گے جبکہ ایمان اور توحید اُن کے دلوں میں ہو گا خواہ وہ کسی درجہ کا بھی ہو چنانچہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم وحولہ عصابۃ من اصحابہ بایعونی علی ان لا تشرکوا باللہ شیئاً ولا تسرقوا ولا تزنوا ولا تقتلوا اولادکم ولا تاتوا ببھتان تفترونہ بین ایدیکم وارجلکم ولا تعصوا فی معروف فمن وفی منکم فاجرہ علی اللہ ومن اصاب

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درحالیکہ آپ کے گرد اگرد ایک جماعت تھی آپ کے صحابہ میں سے کہ مجھسے بیعت کرو اور عہد کرو اس بات کا کہ اللہ کیساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھیراؤ گے اور نہ چوری کرو گے اور نہ زنا کرو گے اور نہ اپنی اولادوں کو قتل کرو گے اور نہ مونھ در مونھ کسی پر بہتان باندھو گے نہ دین کے نیک کاموں میں نافرمانی کرو گے۔ پس جسنے یہ عہد پورا کرد کھایا تو اس کا ثواب

من ذلک شیئاً فعوقب بہٖ فی الدنیا فھو کفارۃ لہٗ ومن اصاب من ذلک شیئاً ثم ستر اللہ علیہ فھو الی اللہ ان شاء عفا عنہ وان شاء عاقبہ فبایعناہ علی ذلک (رواہ البخاری والمسلم)۔

اللہ پر ہے اور جو ان ممنوعہ باتوں میں سے کسی چیز کا مرتکب ہوا اور دنیا میں بات کھل گئی اور اسے سزا دی گئی (جیسے چوری پر ہاتھ کاٹ دیا گیا زنا پر سنگسار کر دیا گیا وغیرہ وغیرہ) تو وہ دنیا میں اس کیلئے کفارہ ہو گیا (مگر آخرت کا عذاب باقی رہا) اور اگر ان باتوں میں کسی چیز کا مرتکب ہوا اور دنیا میں بات چھپی رہ گئی تو وہ آخرت میں اللہ کی مشیت پر ہے چاہے اُسے معاف فرما دے (بشرطیکہ حقوق العباد نہ ہوں) اور چاہے سزا دے یعنی جہنم میں داخل کر دے تو ہم نے آنحضرت سے اس بات پر بیعت کی اور عہد کر لیا۔

اس حدیث سے صاف واضح ہے کہ مسلمانوں سے فقط شرک ہی سے بچ جانے کا عہد نہیں لیا گیا جیسا کہ بادری صاحب نے رسول خدا پر بہتان باندھا کہ حضور نے صرف شرک سے ہی بچ جانے کو ہی کہا ہے گناہوں سے بچنے کو نہیں کہا۔ شرک کے ساتھ چوری زنا قتل ناحق جھوٹ بہتان فسق و فجور نافرمانی اور سارے ہی گناہوں اور نافرمانی احکام شریعت سے بچنے کا یکساں عہد لیا پس اس حدیث کی رُو سے جیسے شرک سے بچنا ضروری ہوا ویسے ہی چوری زنا قتل وغیرہ سے بچنا بھی ضروری ہوا۔ نہ یہ کہ شرک سے بچ جاؤ اور جو چاہے کرتے پھرو۔

نیز جیسے اس حدیث میں شرک کی سزا بتلائی گئی ہے ایسے ہی بدعملیوں کی سزا بھی

بھی بتلائی اور وہ بھی دنیا اور آخرت دونوں میں۔ پھر دنیا میں اگر گناہ چھپا رہ گیا تو اُسے بھی اطمینان نہیں دلایا کہ بات چھپ جانے کے احتمال پر وہ آزاد ہے کہ چھپا چھپا کر جب چاہے گناہ کرتا پھرے بلکہ اُن اعمال پر آخرت کی سزا بدستور قائم رکھی جس سے ڈرایا گیا اور دھمکی دی گئی تا کہ ان شرارتوں کا دروازہ بند رہے پھر اگر اس حدیث میں اللہ کے معاف کر دینے کی خبر بھی دی تو اُسے اللہ کی مشیت اور چاہت پر موقوف بتلایا کہ چاہے وہ معاف کرے چاہے عذاب دے۔ اور یہ چاہنا کسی کے علم میں نہیں دیا گیا تاکہ اس علم ہو جانے پر کہ فلاں کے بارہ میں اس کی مشیت یہ ہے کہ وہ معاف فرما دے گا وہ مطمئن ہو کر گناہوں میں لگا رہے کہ اللہ تو رحیم ہے اور حسبِ وعدہ معاف ضرور فرما دے گا۔

پس اس حدیث عبادت میں شرک و معصیت دونوں کی شدید سزاؤں کی صراحت ہے اور حدیث ابوذر غفاری اس سے ساکت ہے اس کا منشا صرف ایمان کی خاصیت بتلانا ہے کہ وہ گناہوں کے ہوتے ہوئے اپنی خاصیت دکھلائے گا جو نجات ہے خواہ وہ دیر سے ظاہر ہو یا سویر سے۔ گناہوں کی سزا کا ذکر کرنا اس کا موضوع نہیں۔ اس لئے حدیث ابوذر کے نام لگا کر یہ کہنا کہ اسلام نے صرف شرک سے بچنے کی ہدایت کر کے باقی سب بداعمالیوں میں مسلمان کو آزاد کر دیا ہے صریح دھوکہ دہی ہو کر منھ در منھ بہتان بندی ہے باقی رہا یہ کہ یہ سب باتیں حدیث ابوذر ہی میں کیوں جمع نہیں کر دی گئیں؟ تو ظاہر ہے کہ سارا اسلام بھی تو حدیث ابوذر

میں جمع نہیں اور کسی بھی ایک آیت یا روایت میں مجتمع نہیں اور کسی بھی مذہب کی ساری باتیں کسی ایک روایت میں اکٹھی نہیں ہوا کرتیں۔ بلکہ دین کو سمجھنے کے لئے دین کی ساری ہی روایتیں سامنے رکھی جاتی ہیں۔ اس لئے یہاں بھی حدیث ابوذر پر غور کرتے ہوئے یہ اور اسی قسم کی دوسری روایتیں سامنے رکھنی چاہئیں تھیں۔

بہرحال حدیث ابوذر میں بداعمالیوں کا حکم بتلانا مقصود نہیں بلکہ صرف ایمان کا حکم بتلانا ہے۔ کہ وہ آخر کار نجات ہے۔ خواہ اس کے ساتھ نیک عمل ہو یا نہ ہو۔ اور حدیث عبادہ بن صامت میں بدعملی کا حکم بتلانا مقصود ہے وہاں ایمان کے حکم کا کوئی ذکر نہیں۔ پس حدیث ابوذر سے بدعملی کی اجازت نکالنا ایسا ہی ہوگا جیسا کہ حدیث عبادہ سے کوئی عقل کا اندھا بے ایمانی کی اجازت نکالنے لگے کیونکہ حدیث ابوذر میں صرف ایمان کا حکم بتلانا مقصود ہے بدعملی کے حکم سے سکوت ہے۔ اور حدیث عبادہ میں بدعملی کا بتلانا مقصود ہے بے ایمانی اور شرک کے احکام سے سکوت ہے۔ دونوں حدیثوں کو ملا لیا جائے تو ایمان وعمل دونوں کے احکام سامنے آجائیں گے۔

بہرحال دو چیزیں الگ الگ ہوئیں ایک ایمان اور ایک نیک عملی سو ایمان کے ہوتے ہوئے تو نیکی نہ کرنا یا بدی کر گزرنا نجات میں حارج نہیں ہو سکتا ہاں نجات میں ہزاروں برس کی تاخیر پیدا کر سکتا ہے اور کفر کے ہوتے ہوئے نیک عملی عذاب ابدی میں حارج نہیں ہو سکتی۔ خواہ عذاب دیر سے شروع ہو یا فوراً شروع ہو جائے اور خواہ ہلکا ہو یا بھاری مگر دائمی ہلاکت رک نہیں سکتی۔

پس ان دونوں حدیثوں سے دو اثر ظاہر ہوئے ایک کفر کا اثر ایک معصیت کا۔ کفر کا اثر دوامی اور ابدی ہلاکت ہے۔ اور معصیت کا اثر صرف وقتی سزا ہے خواہ وہ ہزاروں برس کی بھی ہو۔ اسی طرح ایک ایمان کا اثر کھلا اور ایک نیک عملی کا۔ نیکی کا اثر صلہ اور انعام ہے اور ایمان کا اثر دوامی نجات ہے پس جیسے کسی مطیع و فرما نبردار کو جو اپنا ہے اسکی بدی اپنائیت سے نہیں نکال سکتی ہاں وقتی سزا بھگتوا سکتی ہے جو خود اپنائیت کی دلیل ہے ایسے ہی کسی باغی و سرکش کو جو کفر و شرک کیوجہ سے بیگانہ اور غیر ہے کوئی نیکی اُسے اپنا اور یگانہ نہیں بنا سکتی۔

دوسرے لفظوں میں اِسے یوں سمجھ لیجئے کہ ایک ہے قانون کو نہ ماننا اور ایک ہے خلاف قانون کوئی حرکت کر گزرنا اِن دونوں حقیقتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے پہلی چیز بغاوت ہے اور دوسری چیز معصیت ہے پہلی چیز سے آدمی اس ملک کی رعایا میں نہیں رہتا اس لئے اُس کی سزا ملک سے دوامی انقطاع ہے خواہ پھانسی دیکر ہو یا دیس نکالا دے کر اور دوسری چیز سے آدمی رعیت کا فرد رہتا ہے مگر بد عملی کی وجہ سے اطاعت شعار نہیں رہتا اس لئے اس کی سزا زدو کوب یا دوسری ایذائیں ہیں کہ جس سے وہ بد عملی سے باز آجائے نہ یہ کہ رعایا سے خارج کیا جائے کہ وہ رعایا ہونے سے نکلا ہی نہیں۔ اس ساری بحث کا حاصل یہ نکلا کہ گناہگاریوں سے آدمی کا ایمان سلب نہیں ہوتا بلکہ باقی رہتا ہے خواہ ضعیف ہی ہو کر رہے اور جب وہ باقی ہے تو بہرحال وہ اپنی خاصیت اور اپنا اثر

دکھلائے گا خواہ ضعف کیوجہ سے وہ اثر دیر سے ظاہر ہو اور ہلکا ظاہر ہو اور وہ نجات ابدی ہے یہی حاصل ہے حدیث ابوذر کا کہ آدمی زنا کرے یا چوری مگر جبکہ وہ مومن ہے کہ ان بد اعمالیوں سے وہ مومن ہونے سے نہیں نکل سکتا تو بلاشبہ داخل جنت ہوگا خواہ ہزاروں برس کا عذاب بھگتنے کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔ تو کون عقل کا اندھا ہوگا جو اس مضمون سے زنا چوری اور بد عملی کا جواز ثابت کرے۔ اور یہ کہے کہ اس حدیث نے بد عملی اور سیہ کاریوں کے دروازے کھول دئے ہیں۔ جبکہ یہ حدیث اس بحث سے ساکت ہے اور گناہوں کی سزا وغیرہ کا بیان اس کا موضوع ہی نہیں بلکہ گناہوں کے ہوتے ہوئے صرف ایمان کا حکم بتلانا اس کا مقصود ونشا ہے نہ کہ بد عملی کی اجازت دینا کہ اس کے لئے دوسری روایات ہیں جن میں ایمان کے ہوتے ہوئے بدی کی دنیوی و اُخروی سزاؤں کا صاف صاف ذکر کر دیا ہے جیسے حدیث عبادت جو ابھی گزر چکی ہے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک بادشاہ اپنی رعایا سے یہ کہے کہ دیکھو اگر تم بغاوت نہیں کرتے ہو تو کیسے ہی جرائم کرو تم رعایا ہونے سے نہیں نکل سکتے اور حکومت نے جتنے بھی حقوق ملک کے باشندوں کو دئے ہیں۔ وہ سب تمہیں حاصل ہوں گے۔ تمہاری زمین جائداد باغ وغیرہ سب تمہارے رہینگے تو کیا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تم کو جرائم کی اجازت دیجاتی ہے یا یہ ہوگا کہ تمہیں رعایا باقی رہنے کی تدبیر بتلائی جاتی ہے۔

بہر حال حدیث ابوذر سے جرائم اور آپ کے مہذب قول کے مطابق

حرام کار بت پرست زِناکار عیاش لونڈے باز چور لالچی شرابی۔ گالیاں دہلنہ اور ظالم بنتے رہنے کی اجازت نکالنا جناب ہی جیسے دانا اور فرزانہ کا کام ہو سکتا ہے اسی کا نام تحریف ہے۔ کہ کسی کلام کے الفاظ کو باقی رکھکر اس کے معنیٰ کو یکسر الٹ دیا جائے۔ جو یہود و نصاری کا پشتینی مزاج ہی جس کے تحت انہوں نے اپنی آسمانی کتابوں کو بھی محرف کیا اور حسد وعناد سے دوسروں کی کتابوں کے لیے بھی وہی چال چلنا چاہتے ہیں جو خود چل رہے ہیں۔

یحرفون الکلم عن مواضعہ
ونسوا حظاً مما ذکروا بہ

پھر اِسے فہم کی انوکھی تیزی کہا جائے یا کیا کہا جائے کہ کہاں بلیا لک کی منرد کہ بیوی سے نکاح کی آیت اور کہاں ابوذر غفاری کی یہ حدیث کہ اس آیت کا بھید اس حدیث سے کھلنے لگے۔ مگر فہم کی ہی تیزی ہے کہ پھر بھی دونوں کا جوڑ ملا کر حدیث سے آیت کا بھید نکالنے کی مہم انجام دے ہی لے گی اور وہ یہ کہ آیت کی رو سے تو معاذاللہ نبی زِنا کے مرتکب بنتے رہے اور حدیث ابوذر کی رو سے اپنی ساری امت کو زنا چوری وغیرہ کی اجازت بخشدی۔ استغفراللہ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ

کبرت کلمۃً تخرج من افواھم
ان یقولون الا کذبا

غالباً یہی وہ "علمی بھید" یا "معرفت کے اسرار" ہیں جو اِس حدیث سے

آپ کے قلب پر وارد ہوئے مگر ان کی حقیقت ہم پر منکشف ہوئی جسے سطور بالا میں کھول دیا گیا۔

چوتھا اعتراض

اسلام جبری مذہب ہے اخلاقی نہیں

آپ نے اسلام سے معیار اخلاق کی نفی کرتے ہوئے چوتھا شبہ یہ پیش کیا ہے کہ اسلام بر دئے قرآن ایک جبری مذہب ہے جو نوک شمشیر سے پھیلایا گیا ہے خود اسلام میں کوئی اخلاقی یا استدلالی جاذبیت نہیں جو اُسے پھیلاتی۔ بخلاف انجیل کے کہ اس نے اپنے کو اخلاقی قوتوں سے منوایا ہے چنانچہ آپ کے والا نامہ کی عبارت اس بارہ میں حسب ذیل ہے۔

اگر ایک پادری یا بہت سے پادریوں نے حکومت کے بل بوتے پر دلائل کو ترک کر کے ظلم و تشدد کے ذریعہ مسیحت پھیلانے کی کوشش کی ہو تو اس کی ذمہ داری بائیبل پر ہرگز نہیں ہو سکتی اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے۔ ہاں بیشک قرآن میں ضرور ہدایت ہے کہ گردنیں مارو اُن کی جب تک نہ ہو جاویں وہ مطیع تمہارے"

(آپ کا خط)

آپ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ انجیل میں جبراً دین منوانے کا کوئی اصول نہیں اگر ایسی صورت کبھی ہوئی بھی ہوگی تو وہ کسی پادری کا شخصی عمل ہوگا جس کی ذمہ داری بائیبل پر عائد نہیں ہو سکتی، لیکن قرآن نے تو

جبراً دین منوانے کا اصول خود اپنے ہی متن میں رکھدیا ہے کہ کفار کی گردنیں مارتے رہو جب تک وہ تمہارے مطیع نہ ہوجائیں تو اس کی ذمہ داری بجائے کسی مولوی وغیرہ پر عائد ہونے کے خود قرآن اور دین اسلام پر عائد ہوتی ہے۔ میری گذارش یہ ہے کہ آپ قرآن کریم کی کسی آیت قتال کا ترجمہ تو نقل کردیا کہ گردنیں مارو اُن کی جب تک نہ ہوجاویں وہ مطیع تمہارے لیکن یہ ظاہر نہیں فرمایا کہ وہ آیت کونسی ہے جس کا یہ ترجمہ دکھلایا گیا ہے کیوں اس ترجمہ کی کوئی آیت ہی قرآن میں نہیں، بظاہر جس آیت کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین للہ ط اس آیت کے مذکورہ ترجمہ سے مقصد غالباً یہ اعتراض پیدا کرنا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے اور گویا اسلام میں قتل و قتال یا جہاد کی غرض و غایت دین کو جبراً منوانا ہے جس سے انجیل بَری ہے۔ لیکن اس آیت کا یہ ترجمہ ہی سرے سے غلط ہے جو آپ نے پیش کیا ہے اور اس غلط ترجمہ ہی کا نتیجہ یہ اعتراض ہے جسے آپ لکھ رہے ہیں اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "اُن سے قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کیلئے ہوجائے" اس ترجمہ سے کھل جاتا ہے کہ یہ قتل و قتال اور جہاد دین منوانے کے لئے نہیں بلکہ فتنہ و فساد مٹانے کیلئے ہے۔

فتنہ کہتے ہیں کسی قانون یا نظام کے خلاف فساد و بدامنی اور نفرت دانتشار پھیلانے اور ریشہ دوانیاں کرکے بغاوت کا راستہ ہموار

کرنے کو، تاکہ وہ قانون و نظام یا قائم ہی نہ ہو سکے۔ یا قائم شدہ ہے تو باقی نہ رہے یا مغلوب ہو کر غیر مؤثر ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال جب دنیوی نظاموں میں برداشت نہیں کیجاتی جن میں صرف جان و مال ہی کا سوال ہوتا ہے تو دینی نظاموں میں کیسے برداشت کیجانی چاہیئے جن میں ایمان و نجات کا سوال ہے۔ اگر عیسائیوں کا کوئی مشن پوپ کے نظام کے ماتحت کسی ملک میں تبلیغ کرنے کے لئے جائے تو لوگوں کو یہ حق تو ہونا چاہیئے کہ جو اُن کی سمجھ میں نہ آئے وہ اُسے قبول نہ کریں یا اس کی حجت و برہان کا مطالبہ کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہیں تو پہنچ سکیں۔ لیکن اصولاً یہ حق نہیں ہونا چاہیئے کہ تعصب کے تحت اُس کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پھیلا کر اس میں فتنہ انگیزی کریں بدامنی پھیلا کر لوگوں کو بات سننے کا موقعہ ہی نہ دیں اس کے خلاف انتشار پھیلا کر اس سے روکنا ہی ایک مستقل مشن بنا لیں۔ آجکی جمہوری حکومتیں بھی بار بار یہی اعلان کرتی رہتی ہیں کہ ملک کی پارٹیاں حکومت کے خلاف نکتہ چینی کر سکتی ہیں لیکن اس کے خلاف ملک کو اکسانے یا تشدد اور بغاوت پھیلانے کی انھیں اجازت نہیں دیجا سکتی۔ اور اگر کوئی پارٹی بغاوت اور فتنہ پردازی کا رخ اختیار کر لیتی ہے تو اُسے قوت سے دبا دیا جاتا ہے جسے کوئی بھی بے انصافی یا ظلم نہیں کہتا اسیطرح دین اسلام نے بھی اپنے تبلیغی نظام میں بھی فطری روش اختیار کی کہ اسلام کو بین الاقوامی دین بتلا کر پوری دنیا میں اُسکی

تبلیغ کا ایک منظم سلسلہ قائم کیا۔ پھر جس نے بھی اس کے خطاب پر حجت کا مطالبہ کیا تو اس نے عقلی اور نقلی حجتیں پیش کر کے مطمئن کیا گیا یا جس نے اس پر تنقید اور نکتہ چینی کا راستہ اختیار کر کے اس کے اصول و فروع کی تحقیق چاہی تو اسے دلائل و براہین سے تحقیقی بات بتلائی اور شبہات کے جوابات دیے جگہ جگہ قرآن نے بھی یہی کہا کہ یہ کتاب (قرآن) اسی لیے اتاری گئی ہے کہ لوگ تدبر اور تحقیق کا راستہ اختیار کریں عقل و فکر سے بات کو سوچیں اور سمجھ کر قبول کریں۔ لیکن اگر کسی نے از راہ تعصب و عناد اس نظام تبلیغ میں روڑے اٹکائے اور اس کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات بھڑکا کر انتشار اور فتنہ پھیلانا چاہا تو اسلام نے تلوار اٹھائی اور فتنوں اور فتنہ انگیزوں کو قوت سے دبا دیا تاکہ فتنہ ختم ہو جائے اور لوگوں کو پر سکون فضا میں دین کے سننے سمجھنے سوچنے اور رائے قائم کرنے کا موقعہ ملے آگے قبول کرنا نہ کرنا کلیتہً ان کے اختیار میں دیدیا تاکہ کوئی بھی دین قبول کرنے پر بے سوچے سمجھے مجبور نہ ہو۔ قرآن نے اس بارہ میں صاف طور پر ایک اصولی اعلان کر دیا گیا کہ۔

لا اکراہ فی الدین — دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔

پھر اللہ نے اس اصول کی روشنی میں اپنے رسول کو خصوصیت سے اس جبر سے رکے رہنے کی ہدایت فرمائی کہ۔

افانت تکرہ الناس — تو کیا والے رسول، آپ لوگوں کو مجبور

حتیٰ یکونوا مومنین۔ کرینگے کہ وہ مومن ہو جائیں یعنی یہ حق آپ کو نہیں دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ جب قرآن کے اعلان کے مطابق دین جبری نہیں اختیاری ہے تو کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی تھی کہ قرآن دین کو جبراً منوانے کے لئے خود اپنے کہے کے خلاف تلوار اٹھانے کا حکم دیتا۔ البتہ اس نے اُن فتنہ پردازوں کے خلاف تلوار ضرور اٹھائی جو دین سے روکنے اور اس پر غور تک کی مہلت نہ دینے کے لئے شر و فساد کے راستہ سے سامنے آئے اور اس نظام کو دنیا سے نیست و نابود کر دینے کے منصوبے کھڑے کرنے میں ہمہ وقت لگے رہے۔

اسلام میں مادی شوکت و قوت اور نظام حکمرانی قائم کرنے کی یہ بھی ایک بڑی مصلحت تھی کہ اس آخری دین کے بارہ میں اعلان حق بلا روک ٹوک ہو سکے۔ ہر ملک و قوم میں اس کا آوازہ پہونچ جائے اور جبکہ اس کے دنیا میں آنے کے بعد سابقہ ادیان منسوخ ہو گئے تو دنیا کی کوئی قوم بلا دین کے نہ رہ جائے۔ اب خواہ قبول کرے یا نہ کرے وہ اس کا فعل ہوگا اور اُسی پر اُس کی ذمہ داری داری عائد ہوگی تاہم وہ قبول پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ سو اگر خالص مادی نظاموں کے خلاف فتنہ و فساد اٹھانے پر تلوار اٹھانا خلاف عقل نہیں تو اس تہذیب و نفس اور اصلاح عالم کے روحانی نظام کے خلاف فتنہ پردازی پر قوت سے کام لینا جبکہ قبول و عدم قبول میں

ہر شخص آزاد بھی ہو کر کیوں کر خلافِ عدل ہو سکتا ہے ۔؟

بہر حال قتال و جہاد کی غرض اسلام میں دین منوانا نہیں بلکہ راہ تبلیغ سے فتنوں کو ہٹانا، مٹانا، اور اشاعت اسلام کے خلاف سازشوں اور فتنہ انگیزیوں کے جال کو توڑ دینا ہے، تاکہ دینِ الٰہی ایک دفعہ پورا کا پورا دنیا کے سامنے آجائے جس کا جی چاہے اسے بصیرت و حجت کے ساتھ قبول کرے۔ جس کا جی چاہے نہ قبول کرے۔

فمن شاء فلیؤمن ومن شاء

فلیکفر انا اعتدنا للظلمین

نارا احاط بھم سرادقھا۔

ظاہر ہے کہ یہ طریق کار نہ عقل کے خلاف ہے نہ دیانت کے اور نہ ہی دنیا کے ماضی و حال کی تاریخ سے الگ کوئی نئی اور نرالی بات ہے جسے لوگ نشانہ ملامت بنانے میں حق بجانب سمجھے جائیں۔

پھر اس قتال و جہاد کی اجازت بھی اس وقت دی گئی جب مکہ کی تیرہ سالہ زندگی کی مصیبتیں انتہا کو پہونچ گئیں اور کسی طرح بھی لوگوں نے رسول کا پیغام نہ خود سنا نہ کسی کو سننے دیا بلکہ اس کے خلاف نفرت پھیلا دینے کے جگہ جگہ جال بچھا دیے تاکہ کسی طرح آوازہ حق کانوں کے قریب بھی نہ آنے پائے، چہ جائیکہ لوگوں کو اُس پر غور و فکر کا موقعہ ملے۔ جب بھی تبلیغ کا موقعہ آتا تو صورت یہ ہوتی کہ ادھر تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہر شہر قریہ بہ قریہ اور گھر گھر پیغام الٰہی سناتے پھر رہے

ہیں اور اِدھر اُدھر آپ کے پیچھے پیچھے کبھی ابولہب کبھی ابوجہل اور کبھی دوسرے قریشی سردار مع اپنی اپنی پارٹیوں کے چیختے جا رہے ہیں کہ لوگو یہ (معاذاللہ) ساحر ہے مجنون ہے کذاب ہے جادو زدہ ہے اور شریر ہے اس کی آواز پر کان مت دھرو۔ اور باپ دادا کے دین کو اس کے کہنے سے ہرگز مت چھوڑو اِدھر قرآن سنایا جا رہا ہے اور اُدھر شور و شغب مچایا جا رہا ہے کہ رسول کی آواز بھی کانوں تک نہ پہنچنے پائے۔ کفار کا مقولہ اور طرزِ عمل قرآن نے بھی ذکر کیا ہے کہ۔

لا تسمعوا لھذا القرآن (اس قرآن کو سن کر ہی نہ دو اور شور مچائے
والغوا فیہ لعلکم تغلبون ۰ جاؤ تاکہ تم غالب آجاؤ۔ (اور دین کی آواز مغلوب ہو جائے)

اُدھر قومی عصبیتوں کو بھڑکا بھڑکا کر اللہ کے رسول کے خلاف قوم میں اشتعال ایسا پیدا کر دیا گیا کہ پیغام رسول تو بجائے خود ہے خود رسول کو ہی دنیا میں چین نہ ملے کہ وہ خود بھی اطمینان سے اللہ کی بندگی کر سکیں اور اپنا کارِ منصبی انجام دے لیں۔ چنانچہ کوئی ایذا رسانی ایسی باقی نہ رہی جو آپ کے خلاف روا نہ رکھی گئی ہو۔ اور کوئی بھی مکروہ سے مکروہ قسم کی رکاوٹ نہ چھوڑی گئی ہو جو آپ کے راستہ میں حائل نہ کی گئی ہو۔ کہیں آپ پر سحر کرایا گیا کہ آپ بول ہی نہ سکیں۔ کہیں راستوں میں کانٹے بچھا دیے گئے کہ آپ تبلیغ دین کے لیے چل بھی نہ سکیں کہیں آپ کے پیچھے کتے لگا دیے گئے کہ آپ آبادی میں گھس بھی نہ سکیں کہیں

عین عبادت کی حالت میں آپ کی گردن پر اونٹ کا اوجھ لاد دیا گیا کہ سر بھی نہ اٹھا سکیں کہیں "ٹھٹے" اور تمسخر سے آپ کی بات ہی اڑا دی گئی کہ لوگ ادھر التفات بھی نہ کرنے پائیں۔ کہیں آپ کا بائیکاٹ کرکے دانہ پانی بند اور بند گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا گیا کہ معاش تک بھی فراہم نہ فرما سکیں۔ پھر آپ کے ساتھیوں پر مظالم کی حد ہو گئی کسی کو مارا جاتا کسی کے زخم لگائے جاتے اور وہ زخم خوردہ حضور کے پاس آتے آپ صبر و تحمل کی تلقین فرماتے اور فرما دیتے کہ مجھے قتال کی اجازت نہیں ہے۔

غرض اِدھر تو نصیحت و موعظت کے راستے بند کر دیے گئے اُدھر اس مقدس واعظ کے خلاف نفرت و اشتعال پیدا کر دیا گیا جس سے رسول اور پیغام رسول دونوں انتہائی طور پر مظلوم اور بیکس ہو گئے آخر میں مار پٹائی قتل و غارتگری اور آخر کار رسول اور مطیعان رسول کو شہر بدر تنگ کرنے کی صورتیں پیدا کرکے اُن پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا جس سے آپ کے کتنے ہی خدام گھر بار جائداد اور وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور کتنے ہی حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے پھر وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا گیا اور ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے سلسلہ وہاں بھی پہنچا دیے گئے کہ غیر ملک میں بھی انہیں چین نہ ملے مگر خدا رحم کرے حبش کے عیسائی بادشاہ نجاشی پر کہ اس نے ان مہاجرین کو پناہ دی اور عزت و احترام سے انھیں اپنے ملک میں ٹھیرنے

اجازت دی اور پھر اپنی حق پسندی سے اسلام بھی قبول کر لیا کیونکہ وہ انجیل کی تعلیم کے مطابق خود بھی نبی آخر الزماں کا منتظر تھا۔ شاید جناب کے خیال میں بے کس مہاجر مسلمانوں نے اس پر بھی اسلام لانیکے بارمیں کوئی جبر و تشدد کیا ہوگا؟ پھر مکہ میں باقیماندہ افراد کو چین نہ لینے دیا گیا۔ تو بالآخر مکہ کے سارے مسلمان اور آخر کار خود رسول رب العالمین بھی ترک وطن پر مجبور ہوئے اور یثرب (مدینہ) کی طرف ہجرت فرمائی۔ تو وہاں بھی انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا۔ اور ان کے خلاف یہودیوں سے گٹھ جوڑ کر کے مختلف قسم کی سازشیں کرائی گئیں کہ پیغام الٰہی کی نشر و اشاعت تو درکنار پیغام سنانے والے بھی زندہ نہ رہنے پائیں تاکہ آئندہ بھی اس پیغام کے سامنے آنیکی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ غرض مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں کامل تیرہ برس ان اللہ کے نام لیواؤں پر سختیوں کی انتہا ہوگئی۔ آخر کار جب پانی سر سے گذر گیا اور صبر و تحمل اور عفو و درگذر کی حد ہو گئی دین اور مبلغین دونوں عاجز آگئے۔ دونوں کی مظلومیت بھی انتہا کو پہنچ گئی اور فتنہ حد سے گزر گیا جس سے اصل مقصد اصلاح عالم اور تبلیغ دین فوت ہونے لگا تب اِن مظلوموں کو ظالموں کے خلاف تلوار اٹھانیکی اجازت دی گئی اور ذیل کے پاکیزہ اور بین الاقوامی عنوان سے اجازت قتال (جہاد) کی دستاویز انہیں عطا ہوئی تاکہ دین کے پیغام سنانے اور دینی مراکز کے بچانے کی راہ نکلے۔ فرمایا

اُذِنَ لِلَّذِینَ یُقَاتَلُونَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ — جن سے کافر لڑتے ہیں انہیں لڑائی کی اجازت دیگئی اس وجہ سے کہ ان پر ظلم ہوا اور

لقد یران الذین اخرجوا من دیار ہم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ۔
ولولا دفع اللہ الناس بعضہم ببعض لہدمت صوامع وبیع وصلوٰت ومساجد یذکر فیہا اسم اللہ کثیراً ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز
(الحج)

بلا شبہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے وہ جو نکالے گئے اپنے گھروں کر ناحق سوائے اس کے (ان کا کوئی قصور نہیں) کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو۔ ایک کو ایک سے تو (اپنے اپنے زمانہ میں) خلوت خانہ اور مدرسہ اور عبادت خانہ اور مسجدیں جن میں نام لیا جاتا ہے اللہ کا بہت سب منہدم کر دیے جاتے ہیں بے شک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کریگا جو اللہ کے دین کی مدد کرے گا۔

یہ آیت بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اجازت قتال کی پہلی آیت ہے جو مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں قتال سے روکنے کی ستر سے زاید آیتوں کے بعد نازل ہوئی ۔ اس سے صاف واضح ہے کہ اسلام میں تلوار اٹھانے کی غرض وغایت دوسرے ادیان کو مٹانا یا اسلام کا جبراً پھیلانا نہیں ورنہ اس جہاد کے سلسلہ میں عورتوں، بوڑھوں، رہبانوں، بچوں، اور معذوروں مثل اندھوں وغیرہ کے قتل کی ممانعت نہ کیجاتی حالانکہ یہ بھی تو سب غیر مسلم ہی ہوتے تھے نیز محض ملک گیری اور حصول سلطنت ہی علی الاطلاق مقصود جہاد نہیں ورنہ صلح ومعاہدہ سے غیر مسلموں کا ملک انہی کے ہاتھوں میں نہ چھوڑا جاتا اور جزیہ قبول کر کے غیر مسلموں کا ذمہ نہ لیا جاتا بلکہ حقیقی

غرض وہی ظلم اور فتنہ کا دبانا اور مظلوموں کو ظالموں کے پنجہ سے چھڑانا ہے خواہ وہ مدافعت سے ہو یا ہجوم سے تاکہ دین کو پر سکون فضا میں لوگوں کے سامنے آنے اور اپنے کو سمجھوانے کا موقع مل سکے۔

اس آیت نے اعتراض کنندوں کا مونھ بند کرنے کے لئے حق تعالیٰ کی اس سنت قدیمہ پر پوری روشنی ڈالی ہے کہ جب بھی باطل پرستوں نے حق پرستوں کے راستے اسی انداز سے بند کئے جو انداز مشرکین مکہ نے اختیار کر رکھا تھا تو اسی طرح اہل حق کو تلوار سے مدافعت اور قتال کی اجازت دیگئی ہے۔ چنانچہ اہل کتاب کے مقابلہ پر بھی جب باطل پرست قومیں آئیں اور انپر عرصہ حیات تنگ کر دیا اور گرجوں، خانقاہوں، اور عبادت گاہوں کو اجاڑ دینا چاہا تاکہ عبادت خداوندی دنیا سے نیست و نابود ہو جائے تو حق تعالیٰ نے اس وقت کے اہل حق کو تلوار اٹھانیکی اجازت دی اور ایک قوم کی مدافعت دوسری قوم سے کرائی نہ اس لئے کہ وہ اپنا انتقام لیں بلکہ اس لئے کہ خدا کی عبادت گاہوں خانقاہوں اور کنیسوں کو بچا کر اللہ کی یاد کو باقی رکھیں جس سے خدا کا نام نیچا نہ ہونے پائے۔

بتلانا یہ ہے کہ اللہ کی جو سنت اہل کتاب اور اُن سے بھی پہلی اقوام کے وقتوں سے چلی آ رہی ہے جسپر دنیا کی تاریخ شاہد ہے وہی سنت اگر اسنے اسلام کے دور دورے میں بھی قائم رکھی اور مظلومیت کی انتہا پر مسلمانوں کی ہاتھوں میں بھی تلوار دیدی کہ وہ مسجدوں خانقاہوں اور ذکر و عبادت کے مرکزوں کو فتنوں سے بچا کر خدا کا دین برپا کریں تو آج اہل کتاب انپر طعنہ زن کیوں

میں جبکہ وہ خود بھی اور اُن سے بڑھ کر بھی اسی راستہ سے گزر چکے ہیں اور وہی عمل کر چکے ہیں جو آج کے مسلم مظلوموں سے کرایا جا رہا ہے بلکہ اہل کتاب کے لئے تو وقت کا تقاضہ اور موقعہ یہ تھا کہ وہ جاہلیت کے مقابلہ پر اسلام کی آواز میں آواز ملاتے اور اسلام کی ساتھ ہو کر جاہلیت کا مقابلہ کرتے کیوں کہ جاہلیت کی آواز حقیقتاً کسی آسمانی ملت کی آواز نہ تھی اور مشرکین عرب کی یہ ظالمانہ شرارتیں کسی سماوی ملّت کے تحفّظ کے خاطر نہ تھیں بلکہ آبائی رسوم اور قومی رواجوں کے برقرار رکھنے کے لیے تھیں جنمیں نہ توحید و رسالت کا کوئی تصوّر تھا نہ مبداٗ و معاد کا نہ عالم غیب کا کوئی عقیدہ شامل تھا نہ رجالِ غیب کا یقین نہ ذات و صفات کے عقیدے تھے نہ تزکیۂ نفس اور تہذیب اخلاق کے اصول نہ صالح معاشرت کا کوئی دیہان تھا نہ اصلاح بشری کا کوئی خیال۔ اگر کچھ تھا تو بت پرستی تھی یا نفس پرستی شرکیہ رسوم تھیں یا ناپاک قسم کے نفسانی رواجات ظاہر ہے کہ یہ صرف اسلام کا ہی مقابلہ نہ تھا بلکہ نفس مذہب اور ہر آسمانی ملّت کی بیخ کنی تھی اور جاہلیت کے اِن مظالم کے رہتے ہوئے اسلام ہی کی نہیں کسی بھی آسمانی ملت کی آواز نہیں ابھر سکتی تھی خواہ وہ نصرانیت ہوتی یا یہودیّت۔ اس لئے جب اسلام نے اس مذہب کُش حرکت کے مقابلہ میں آواز اٹھائی تو موقعہ تھا کہ تمام آسمانی ملّتوں کے مدّعی اسکی آواز میں آواز مِلاتے جبکہ جاہلیت اُن سب کے مٹانے کی فکر میں تھی اور اِدھر اُن کا رشتہ جاہلیت کی نسبت اِسلام سے

زیادہ قریب کا تھا اور کم از کم وہ بنیادی اصول میں کسی نہ کسی حد تک اسلام سے اشتراک بھی رکھتے تھے چنانچہ اسی بنا پر قرآن نے اس بنیادی اشتراک کو پیش کرتے ہوئے انہیں اپنی طرف کھینچنے کی سعی بھی کی اور اعلان کیا کہ

قل یا اھل الکتاب تعالوا	تو کہہ (اے پیغمبر) اے اہل کتاب آؤ ایک
الی کلمۃ سواءٍ بیننا وبینکم	بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں
ان لا نعبد الا اللہ ولا	کہ بندگی نہ کریں مگر اللہ کی اور شریک
نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ	نہ ٹھیرادیں اس کا کسی کو اور نہ بنادے
بعضنا بعضاً اربابا من	کوئی کسی کو رب سوا اللہ کے اور نہ بنادے
دون اللہ۔	ہم میں سے کوئی کسی کو اب خدا کو چھوڑ کر

کہ اس کے قول و فعل کو دین سمجھ کر واجب الطاعت سمجھ لیا جاوے بلکہ ہم صرف اللہ ہی کو رب اور واجب الاطاعت حاکم اور شارع سمجھیں رہے اس توحیدی عمل کے پروگرام یعنی شریعتیں تو وہ اگر مختلف بھی رہیں تو اس اتحاد اور وحدت کلمہ میں مانع نہیں ہو سکتیں۔

لیکن افسوس ہے کہ اہل کتاب بجائے اس کے کہ جاہلیت کے مقابلہ میں۔ اسلام اور اس کے جہاد کی حمایت پر کھڑے ہوتے اور جاہلانہ رسم و رواج کے مقابلہ میں آسمانی آواز کا ساتھ دیتے اور الٹا اس جہاد و قتال پر اعتراضات کی بوچھار کرنے کھڑے ہو گئے اور یہ اشتعال انگیز پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ جہاد تو جبراً دین منوانے اور قوموں کو بنوک شمشیر مسلمان بنانے کیلئے اٹھایا گیا ہے حالانکہ قرآن کے اس اعلان جہاد میں کوئی۔

ایک لفظ بھی ایسا نہ تھا جس سے یہ مطلب نکالا جاتا مگر حیرت یہ ہے کہ انہوں نے اِن غلط منصوبوں کو خود قرآن سے ہی باور کرانے کے لئے آیتوں کے مفہوم غلط لئے اور آجتک اسی قدیم اور غلط روش کی پیروی میں سرگرم عمل ہیں۔ آج بھی آیاتِ قتال کے ترجمے تک غلط کئے جا رہے ہیں تاکہ یہ جبراً دین منوانیکا پروپیگنڈہ قائم رہے جس کی ایک مثال ابھی گزری اور دوسری یہ سامنے ہے جو قائل کے منشار کے خلاف اس کے قول کے غلط معنی لینے اور باور کرانے کی نہایت ہی مکروہ مثال ہے جسے دیانت ہی نہیں معمولی عقل بھی برداشت نہیں کر سکتی ہاں بری قسم کا تعصب اور قومیت کی اندھی حمایت جسے حمیت جاہلیت کہتے ہیں اس کا تحمل کرے تو کرے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کی بدولت جاہلیت تو مٹ گئی مگر یہودیت و نصرانیت نے جاہلیت کی جگہ لے کر بجائے جاہلیت کی مخالفت کے خود اسلام کی مخالفت شروع کر دی حالانکہ اسلام جاہلیت کے مقابلہ پر انہیں اپنے سے قریب کرنے کے حق میں تھا۔ بہرحال آیت بالا سے (جس کا غلط ترجمہ کر کے اسلام کو جبری دین باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے) واضح ہے کہ اسلام نے اپنے کو منوانے پر کبھی کسی کو مجبور نہیں کیا بلکہ تلوار فتنہ کے مٹانے کے لئے اٹھائی اور اگر اہل کتاب کے خلاف بھی اٹھائی تو وہ بھی دین منوانے کے لئے نہیں بلکہ ان کا فتنہ مٹانے کے لئے اٹھائی جبکہ قرآن نے ہی اپنی آیتوں میں کھلے طور پر یہ اعلان کر دیا کہ دین ہرگز جبری نہیں اور پیغمبر کو

حکماً اس کا پابند بنایا کہ وہ جبر واکراہ سے کسی کو مومن نہ بنائیں حجت وبرہان اور خلق عظیم سے دین پیش کریں جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے

پھر یہ اسلام کا اصول ہی نہیں تاریخ بھی ہے کہ اس کے ذمہ دار اور پیغمبر پیروؤں نے قبول دین کیلئے کبھی کسی کو مجبور نہیں کیا صحابہ اور تابعین ائمہ مجتہدین اور علماء ربانیین صوفیاء کرام اور حکماء اسلام کی یہی تاریخ ہے کہ انہوں نے حجت اور محبت سے دین پیش کیا نہ کہ نوک تلوار سے۔ عرب کے بڑے بڑے شیر دل مسلمان۔ صدیق اکبر فاروق اعظم، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰ، اور اُن جیسے کتنے ہی دلاور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین جو آگے چل کر اسلام کے بہادر جنرل اور اولوالعزم ثابت ہوئے۔ اکثر وبیشتر مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں اسلام میں داخل ہوئے جب کہ تلوار ہی نہیں کسی کے مقابلہ پر زبان ہلانے کی بھی اجازت نہ تھی ایشیاء کوچک کے لاکھوں تُرک وتتار اس وقت دائرہ اسلام میں داخل ہوئے جب انہوں نے مسلمانوں کے ہاتھوں سے تلوار چھین لی اور اُن کے مرکزوں کو فتح کر لیا۔ ہندوستان میں مسلمان آئے تو ابتداً پست اقوام نہیں بلکہ زیادہ تر وہ بہادر قومیں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں جن کے خود کے ہاتھوں میں تلوار تھی اور مسلمانوں کے ہاتھوں میں تلوار نہ تھی اُن کے بارہ میں یہ تاریخ بتانا کہ وہ جبراً مسلمان بنائے گئے اُنکی اُن کے خاندانوں کی اور ان کے پورے دائرہ کی توہین ہے پھر اسکے بعد ہندوستان کے دوسرے دور میں انگریزوں کے تسلط کے بعد

مسلمان تین کروڑ سے دس کروڑ تک پہونچ گئے جبکہ اُن کے ہاتھ تلوار اور حکومت سے خالی ہو گئے اس لئے اسلام کی تاریخ بھی بعینہ وہی ہے جو اُسکا اصول ہے کہ۔

لا اکراہ فی الدین — دین میں کوئی جبر نہیں۔

اب اگر کسی بادشاہ یا غیر مبصّر مولوی یا غیر ذمّہ دار قسم کے کسی مسلمان نے جبراً کسی کو دین میں داخل کیا ہے تو اسکی ذمّہ داری اسلام یا اُسکی تاریخ پر عائد نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ایسے غیر ذمہ دارانہ واقعات سے دین پر کوئی تہمت آسکتی ہے جیسا کہ اصولاً آپ نے بھی اُسے اپنے گرامی نامہ میں تسلیم کیا ہے اس بیان سے جو قرآن کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے آپ کا وہ شبہ زائل ہو جانا چاہیئے جو اس بارہ میں آپ کو آیت قتال کے غلط ترجمہ سے پیش آیا۔ اور آپ نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ خود قرآن نے ہی دین کو جبراً منوانے کا اصول پیش کیا ہے درحالیکہ جبر واکراہ نہ قرآن کا اصول ہے نہ تاریخ۔ اور کسی مذہب کے اصول اور تاریخ کو چھوڑ کر اس پر اعتراض کرنا اُس پر حجّت نہیں بن سکتا۔ اس لئے جناب کا یہ الزام یا مسلمانوں پر حجّت نہیں ہے اور جس حد تک اُسے خلجان پیدا ہو سکتا تھا وہ اُن عرض کردہ تفصیلات سے رفع ہو جانا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپنے اپنے گرامی نامہ میں اسلام کے اخلاقی نظام کی نفی یا پستی یا اس کے مخدوش بنانے کے بارہ میں جو چار شبہات پیش کئے تھے میں اُن کے جواب سے

فارغ ہو چکا ہوں اور آپ کے سامنے پوری تفصیل کے ساتھ اُن چاروں امور کے سلسلہ میں مسائل کی اصلی اور واقعی حقیقت رکھدی جس کا حاصل یہ ہے کہ اخلاق کا نظام اگر دنیا کے کسی مذہب نے مکمل کر کے پیش کیا ہے تو وہ صرف اسلام ہے بلکہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بڑی غرض و غایت ہی اِسلام نے تکمیل اخلاق ظاہر کی ہے۔

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاق (الحدیث) میں بھیجا ہی اس لئے گیا ہوں کہ کریمانہ اخلاق کی تکمیل کر کے اسکا مکمل نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر دوں۔

یہ دعویٰ ہے اور اخلاق کاملہ کا وہ مکمل نظام جس کے ننانوے اصول عرض کیے گئے اس دعویٰ کی دلیل ہے اور قرآن و حدیث کے وہ ابواب جو اخلاق کی قسموں اُن کے درجات و مراتب اُن کے آثار اور اُن کے حاصل کرنے کے اسباب و وسائل پر مشتمل ہیں اس نظام کی تفصیل ہے جسکے لئے ایک مستقل فن مسلمانوں نے قرآن و حدیث کی روشنی سے قائم کیا جس کا نام تصوّف ہے اور اس کے حامل ایک عظیم طبقہ ہے جس نے مسلمانوں کو تزکیۂ اخلاق پر لگایا جس سے نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی متاثر اور مستفید ہوئے اس لئے یہ دعویٰ کہ اسلام میں اخلاقی نظام نہیں اُسکے ہم معنی ہے کہ اسلام ہی دنیا میں نہیں اور یہ ایک ایسا صریح جھوٹ ہوگا کہ بولنے والے اُس سے چاہے نہ شرمائیں مگر دنیائے انسانیت کی گردن شرم سے یقیناً جھک جائیگی۔

نیز اس نظام کی نفی پر لے پالک کی متروکہ بیوی سے موھنہ بولے باپ کا نکاح یا حدیث ابوذر غفاری کا غلط مفہوم یا اسلام کے جبری ہونے کا ادّعاد غیرہ کے افسانے جو بطور دلیل کے پیش کئے گئے تھے جبکہ وہ اسلامی تصریحات سے بادر ہوا ثابت ہو گئے تو اسلام کا نظام اخلاق بیغبار ہو کر خود ہی اپنی اصلی شان سے نمایاں ہو گیا والحمد للہ علیٰ ذلک۔

جوابات کی اِن ساری تفصیلات کو (جو آپکی فرمائش کیمطابق قرآن کی روشنی میں پیش کیگئی ہیں) سامنے رکھکر اب بنظر انصاف اندازہ لگایا جائے کہ آیا قرآنی تعلیمات چکر میں ڈالنے والی ہیں (جیسا کہ آپ نے دعویٰ کیا تھا) یا یہ ناتربیت یافتہ اور ٹیڑھے دماغوں کا چکر ہے کہ کلام اگر بے دلیل اور حقیقت سے خالی ذکر کیا جائے تو وہ تو آپ کے نزدیک کلام مستقیم ہو اور وہی کلام اگر فطری حقائق اور ایک جامع عقل ونقل ضابطہ کے انداز سے پیش کیا جائے تو چکردار ہو جائے۔ بالفاظ جناب انجیل کا کلام "تو چوری مت کر" "تو زنا مت کر" "تو خون مت کر" تو کلام مستقیم ہے اور یہی کلام جب قرآن نے ایک مکمل ضابطہ کے انداز سے جامع رنگ میں پیش کیا جو اِن احکام کی علتوں حقیقتوں مع وجوہ ودلائل اُن کی نوعیتوں کی تفصیلات اور اُن احکام کے مواقع استعمال کے بیان پر مشتمل ہے جس سے یہ ایک ایک حکم ایک ایک مستقل ضابطۂ حیات کے رنگ سے سامنے آیا جیسا کہ میں تفصیل سے انجیل کے اُس دونوں کلاموں کو تقابل کے ساتھ پیش کر چکا ہوں۔ تو آپ نے اُسے چکر میں ڈالنے والا

فرما دیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دلائل وحقائق اور احکام کی جامعیت کے معنی آپ کے یہاں چکر کے ہیں اور بے دلیل اور بے حقیقت انداز بیان آپ کے یہاں کلام کی استقامت اور راستی کی نشانی ہے۔ ظاہر ہے کہ جن دماغوں میں حقائق و دلائل کے معنی چکر اور اینچ پینچ کے ہوں تو اُن دماغوں کو چکر دار کہا جائے گا یا اس کلام حقیقت نظام کو چکر میں ڈالنے والا کہا جائے گا آپ ہی انصاف سے غور کریں کہ لے پالک کے مسئلہ میں آیا غیر واقعی باپ کو باپ بنا لینا جس میں جزئیت بعضیت کا کوئی علاقہ نہیں جس سے باپ باپ بنتا ہے چکر کی بات ہے یا غیر واقعی باپ کو غیر واقعی رکھکر اس کے مناسب حال اُس پر احکام جاری کیا جانا چکر میں ڈالنے والی بات ہے؟ آیا رواجوں کی لوٹ پھیر کو خدائی قانون پر حاکم سمجھنا چکر کی بات ہے یا رواجوں کو قانون خداوندی کا محکوم اور پابند رکھنا چکر کی بات ہے؟ آیا کلام پیغمبر (مثل حدیث ابوذر) کے الفاظ کو باقی رکھکر خلاف منشا متکلم اُس کے معنی کو الٹ دینا اور معنوی تحریف کر کے متکلم پر اعتراض کرنا چکر کی بات ہے یا کلام کو متکلم کی مراد کے مطابق سمجھکر اسی کے مناسب حال اُس سے نتائج اخذ کرنا چکر کی بات ہے؟ آیا اسلام کو اس کے سارے اصول اور اُس کی پوری تاریخ سے کاٹ کر اُس کے برخلاف محض ذہنی اور قومی تعصب سے اُسے جبری مذہب کہنا چکر کی بات ہے؟ یا اُسکی دیانت و تاریخ سے اُسے ہم آہنگ رکھکر اُسے اختیاری دین باور کرنا چکر کی بات ہے خلاصہ یہ کہ نقل صحیح اور عقل سلیم سے کٹ کر جذبات سے کسی دین کے بارے میں

افواہیں اڑانا اور اُسے بدنام کرنے کی کوشش کرنا چکر کی بات ہے، یا اُسے بنظر انصاف اور بہ نیت تحقیقِ حق مطالعہ کرنا اور بصورت حق قبول کرنے کے لیے آمادہ رہنا چکر کی بات ہے؟ اندریں صورت آپ کے دعویٰ کردہ قرآنی چکر کو سامنے رکھ کر آپ ہی کی پیش کردہ عبارت کا تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر قرآن کی اِن چکر دار باتوں (یعنی انضباط و جامعیت اور ہمہ گیر حقائق و وجوہ احکام) کو قرآن سے نکال لیا جائے تو وہ عام باتیں رہ جائیں گی جو سینکڑوں برس پیشتر سے بائیبل میں بیان ہو چکی ہیں یعنی دلائل و براہین اور جامعیت و انضباط کا ذخیرہ ختم ہو جائے گا۔ جس سے دین کا کمال اور اتمام ظاہر ہوتا۔ تو غور کر لیا جائے کہ کسی دین کی حکمت سے بیزار ہو جانا دماغ کا چکر ہے یا قرآن کا چکر ہے؟

رہا یہ کہ بہت سے احکام قرآن میں وہ ہیں جو انجیل میں پہلے سے موجود ہیں تو قرآن نے یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ وہ ایسی چیزیں لیکر آیا ہے جو پہلے کبھی نہ تھیں اور اُسی نے کوئی ایسا نیا انوکھا دین لا کر پیش کیا ہے جس کا سابق میں کوئی وجود نہ تھا؟ اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ دین آج بھی وہی پرانا ہے جو آدم و نوح ابراہیم و موسیٰ اور داؤد عیسیٰ کا دین تھا ہاں اُس نے اس دین کو بلا شبہ مکمل کیا ہے اور اُس کے تشنہ گوشوں کو بھر کر شریعتوں کے وہ امور ختم کر دیے ہیں جو دنیا کی ترقی یافتہ ذہنیت کے مناسب حال نہ رہے تھے اور جن پر عمل کرنا اس دور کی دنیا میں

ممکن نہ تھا ۔ اُس نے اسی پرانے دین اور اُسی پرانی ملّت ابراہیمی کو عمومیت جامعیت ہمہ گیری بین الاقوامیت اور بین الاوطانیت بخشی ہے جس سے ساری دنیا ایک پلیٹ فارم پر آسکے اور پوری دنیا کا دین ایک ہو جائے جیسا کہ یہی جذبات آج پیدا ہو چکے ہیں جو اسی کی تعلیمات کا غیر شعوری اثر ہے اُس نے اُسی نوعیت کے اصول سے شریعت کو منضبط کر کے اُسی پرانے دین کو پیش کر دیا ہے اب جو احکام سابقہ اُن اصول کے تحت آسکتے تھے انھیں باقی رکھا ہے اور منسوخ کر دیا ۔ پس اسلام تکمیل دین کا دعویدار ہے تاسیس دین (یعنی از سرنو کسی دین لانے) کا مدعی نہیں چنانچہ قرآن کا دعویٰ یہ کہ

وانہ لفی زبر الاولین — وہ اگلوں کی کتابوں میں سمایا ہوا ہے

نہ یہ کہ وہ اگلوں سے بے تعلق ہو کر کوئی نئی نویلی چیز لایا ہے جسکا اگلوں میں کوئی وجود نہ تھا

قرآن کی ہدایت تو اپنے پیغمبر کو یہ ہے کہ ۔

فَبِھُدٰہُمُ اقْتَدِہ — انہیں اگلے پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایت کا آپ بھی اتباع کریں ۔

اور ظاہر ہے کہ سب اگلوں کی لائی ہوئی ہدایت قدر مشترک ہی ہو سکتی ہے جس کا نام دین ہے جس کے تحت زمانہ بزمانہ شرعی پروگرام آتے رہے اور ہنگام بہ ہنگام جاتے اور بدلتے رہے اس لئے بطور طعن یہ کہنا کہ دلائل و براہین اور جامعیت کے احکام کو چھوڑ کر ، قرآن کے احکام وہی ہے جو انجیل میں پہلے آچکے ہیں طعن کیا ہوا جبکہ قرآن اس کا خود معترف بلکہ مدعی ہے اس لئے اس طعن کو دماغی چکر کے علاوہ اور کیا کہا جائے ؟

اِن اعتراضات کا ہدف بہر حال اسلام۔ قرآن پیغمبر کی ذات تھے۔ لیکن جناب نے اعتراضات کے شوق و جوش اور طعن و ملامت کی ابھرنے والی امنگ میں انتہا یہ ہے کہ اللہ میاں کو بھی اعتراض سے نہ چھوڑا اور لے پالک کے مسئلہ میں اِس عنوان سے کچھ بھی شرم محسوس نہ کی کہ۔

اگر اللہ میاں لے پالک بیٹوں کی جوروؤں کو اپنے والدوں کی جورو بنانے کا قرآنی قانون نہ بناتا تو کون سی نیکی کی کمی دنیا میں رہجاتی"

جناب باری میں اس ادب و تہذیب کا کیا ٹھکانا اور دماغ کی اِس بلند پروازی کی کیا انتہا ہے قرآن نے ایسے ہی انسانوں کے بارہ میں کہاکہ

اولم یروا انا خلقنا الانسان من نطفۃ فاذا ھو خصیم مبین :- کیا دیکھتے نہیں ہو کہ ہم نے انسان کو ایک گندہ قطرہ سے پیدا کیا تھا اور (اب) وہی ایک جھگڑالو دشمن (بنا ہوا) ہے۔

اس قانون کے نہ بننے سے جو کمی رہ جاتی اُس کی تفصیل آپ کے سامنے آچکی ہے جس سے آپ کو اپنے دماغ کی کمی محسوس ہوگئی ہوگی۔ اگر اعتراض کرنے والے لے پالک کی حقیقت کو سمجھ کر یہ بے حقیقت اعتراض نہ کرتے تو اُن کی بے دماغی میں کیا کمی رہ جاتی جسے پورا کرنے کیلئے۔ انہوں نے مستند کلام الٰہی پر طعن و تشنیع اور بے باکی و جسارت کی یہ راہ اختیار کی،؟

اگر یہ لے پالک کا قانون نہ آتا تو جاہل قوموں کے رسوم و رواج خود ساختہ شریعت بنے رہتے اور خدائی شریعتوں کو دنیا میں پیر ٹیکنے کا موقعہ نہ ملتا۔ جو بات بھی قوموں کے مالوفات اور مرغوب نفس امور کے خلاف آسمان سے اُترتی

اسی کو زواج کے خلاف کہکر ٹھکرا دیا جاتا اور شریعتوں کو پنپنے کا موقعہ نہ ملتا اگر یہ قانون نہ اُترتا تو بندوں کی حکمرانی خدا پر ہوتی خدا کی حکمرانی بندوں پر قائم نہ ہوتی۔ اگر یہ قانون نہ اُترتا تو بندوں کی بنائی ہوئی مصنوعی باتیں اور وضع کردہ اصطلاحیں حقیقت بنجاتیں اور حقیقتیں دنیا سے رخصت ہو جاتیں۔ بجائے اس کے کہ بندے اپنے رب کا شکر کرتے اور اسکی بھیجی ہوئی ہدایتوں کو سمع وقبول کے کانوں سے سنتے وہ اور الٹا اس کے موںھ آنے لگے اور راہ کفر فرار اختیار کی، اس لئے اس قانون کے اُترنے کا یہ فائدہ کتنا زبردست ہے کہ حق و باطل میں امتیاز اور حق پسند اور باطل پسند افراد میں فرق اور فصل نمایاں ہو گیا فللہ الحمد والمنت

یہ چند تفصیلی گزارشات جو آپ کے شبہات کو سامنے رکھکر ذہن میں آئیں پیش کردی گئیں۔ خدا کرے کہ نفع بخش ثابت ہوں۔ سلسلہ کلام میں بطور الزام واحتجاج جو امور آپ کی شان کے خلاف قلم سے نکل گئے ہوں امید ہے کہ آپ انھیں معاف فرمائیں گے مقصود توہین یا اہانت نہیں اعتراض کے رنگ سے جواب کا رنگ پیدا ہوتا ہے اور اسی کے مطابق ہی ہوتا ہے اس لئے اُسے لازمۂ کلام سمجھا جائے توہین واہانت نہ سمجھا جائے۔ اسی کی ساتھ جرأت کر کے یہ گزارش بھی کردوں گا۔ کہ آپ نے جناب باری سبحانہ تعالیٰ کی شانِ اقدس واطہر میں جو بے باکانہ لب ولہجہ اختیار کیا اس سے آپ بھی توبہ اور استغفار کریں گے اور اِن طالب علمانہ گزارشات کو عصبیتہ سے الگ

ہو کر محض انصاف و طلب و حق کی نگاہ سے دیکھیں گے وباللہ التوفیق

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَّ اٰخِرًا ہ

محمد طیب غفرلہٗ

مدیر دار العلوم دیوبند

۱۰ / ربیع الاول سنہ ۱۳۸۱ھ

(کاتب) سید زاہد حسن دیوبند

تنقید و تبصرہ

مقدمہ انوار الباری شرح اردو صحیح البخاری

از: جناب مولانا احمد رضا صاحب بجنوری دار العلوم دیوبند

سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۲۴۰ کاغذ گلیز ڈ عمدہ، کتابت وطباعت روشن اور واضح، بمعہ سہ رنگ خوبصورت ڈسٹ کور قیمت ۳/۵۰ مجلد ۴/۵

ناشر:۔ مکتبہ ناشر العلوم دیوبند (یوپی)

امام محمد بن اسماعیل البخاری اور ان کی جامع تالیف سے کون واقف نہ ہوگا؟ احادیث نبویہ کا ایک عظیم خزانہ علامہ موصوف نے محفوظ و منضبط فرمایا۔ چنانچہ چھ لاکھ احادیث کا عظیم الشان ذخیرہ مختلف اہل علم اور علمائے حدیث سے اخذ کیا۔ لیکن روایت و درایت کا جو بے مثل انداز اختیار فرمایا کہنا پڑتا ہے کہ اس کی نظیر سوائے اسلام کے کسی بھی مذہب و ملت میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ اس طریقۂ روایت کی تمام تر بنیاد قوت حفظ و ذکاوت پر ہی ہے صاحب بخاری کو اس نعمت خداوندی سے پورا پورا حصہ ملا تھا، آپ نے چھ لاکھ مستند احادیث میں سے بھی ایک لاکھ معتبر ترین احادیث کا انتخاب فرما کر ایک کتاب بنام جامع صحیح مرتب فرمائی۔ امت نے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا جو خطاب موطا امام مالکؒ کو دیا تھا وہ خطاب تالیف بخاری کے بعد اس کو دینے پر مجبور ہوئے۔

مرویات بخاری پر بعد کے اہل علم نے نہ جانے کتنے حواشی اور کتنی شروح لکھیں عربی زبان میں ضخیم سے ضخیم اور مفصل ترین شروح اور حواشی آج بھی موجود ہیں جو امام بخاری کی مقبولیت علمیہ اور ثقاہت علمی پر شاہد عدل ہیں۔

اُردو زبان میں بھی بخاری کی کچھ شروح لکھی گئی ہیں لیکن ضرورت تھی کہ فتح الباری عمدۃ القاری اور فیض الباری کی طرح محققانہ انداز میں کوئی مبسوط تصنیف اس موضوع پر سامنے آئے تاکہ ایک طرف اُردو زبان کے علمی ذخیرہ میں قابل قدر اضافہ ہو اور دوسری طرف عربی سے ناواقف اُردو داں علمی دوست طبقہ فن حدیث میں علمی تحقیقات سے روشناس ہو۔ الحمد للہ کہ اس فرارد واقعی کمی کو جناب مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری تلمیذ رشید علامۃ العصر حافظ حدیث شیخ الاسلام حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پورا کیا۔

مولانا موصوف ایک باشعور اور سنجیدہ عالم ہیں اسی کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے اکثر ارباب علم و تحقیق سے وابستہ رہے ہیں موصوف ایک زمانہ میں ہندوستان کے مشہور ادارہ "مجلس علمی" ڈابھیل کے رکن رکین رہ چکے ہیں اور ایک طویل عرصہ تک "مجلس علمی" کی علمی ذمہ داریوں کے ساتھ انتظامی ذمہ داریاں بھی آپ سے متعلق رہی ہیں۔

موصوف نے اسی زمانہ قیام ڈابھیل میں دو سال تک حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس بخاری میں شرکت کر کے حضرت رح کی تقریر کو قلمبند کیا۔ اس کے علاوہ علامہ نیموی رح کی آثار السنن دو جلد پر حضرت شاہ صاحب نے

جو بے نظیر حدیثی تحقیقات خود اپنے قلم سے تحریر فرمائی تھیں اور اُن کے کچھ نسخے مجلس علمی کراچی نے محفوظ کر دیئے تھے اُن میں کا ایک نسخہ مولانا احمد رضا صاحب کو بھی دستیاب ہوگیا۔

موصوف نے ان ہی امالیٔ علامۃ العصر حضرت شاہ صاحبؒ کو اُن کے علاوہ فتح الباری عمدۃ القاری لامع الدراری، امانی الاحبار، الکوکب الدری، اعلاء السنن اور دیگر کتب حدیث اور شروح بخاری کو سامنے رکھکر محققانہ اور عالمانہ انداز میں شرح بخاری کی تالیف شروع کی۔ اس شرح پر جو مقدمہ تحریر فرمایا وہ مستقل دو کتابیں بن گئیں چنانچہ مقدمہ کی پہلی جلد زیر تبصرہ ہے اس جلد میں مؤلف موصوف نے رجال حدیث پر جو مبسوط بحث کی ہے ان کو پڑھ کر مصنف موصوف کی علم حدیث سے یا بعید دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے۔

مسلک حنفیہ پر اعتراضات کا رد اور مدلل جوابات اس شرح میں خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہیں۔

امید کہ اصحاب ذوق اس گرانقدر علمی ذخیرہ کی قدر افزائی فرمائیں گے۔ اور اس دور قحط الرجال میں ارباب علم کے حوصلوں کو نا قدر شناسی کا شاکی نہ ہونے دیں گے۔ (مولینا قاری) محمد عبد اللہ دیو بندی

تلبیسِ ابلیس

مصنفہ :- امام ابن الجوزی البغدادی رحمہ اللہ

ترجمہ اردو :- از علامہ ابو محمد عبدالحق صاحب اعظمی

سائز ۲۰+۲۶ صفحات ۴۶۸ کاغذ گلیزڈ عمدہ، طباعت روشن

کتابت جلی اور واضح، مجلد عمدہ بمعہ دو رنگ خوبصورت گردپوش،

قیمت دس روپیہ

ناشر :- نور محمد اصح المطابع کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی (پاکستان)

ھندوستان میں ملنے کا پتہ :- ادارہ تاج المعارف دیوبند یوپی

رفعت مضمون اور ندرت عنوان کیلئے ابن الجوزی بغدادی رحمہ اللہ کے نام علمی دنیا میں غیر معمولی شہرت کا حامل ہے۔ موصوف امت اسلامیہ کے ان مستند اور چیدہ علماء میں شمار کئے جاتے ہیں کہ جن کے علوم سے ہر مکتب خیال اور ہر صنف علم کے افراد نے استفادہ کیا ہے، علامہ ابن تیمیہ کی تحقیق کے مطابق ابن الجوزی ایک ہزار سے زیادہ عظیم و ضخیم کتابوں کے مصنف ہیں جس میں تقریباً تمام فنون جیسے تفسیر و اصول تفسیر، حدیث و اصول حدیث، تصوف و فقہ و اصول فقہ تاریخ وعظ و پند، ادب و اشعار اور علم تشریح، پر بیشمار تصنیفات اس امتیاز کے ساتھ تصنیف فرمائیں کہ ہر فن پر بیسیوں کتابیں آج آپ کی علمی یادگار رہیں۔

پیشِ نظر کتاب "تلبیسِ ابلیس" حضرت مصنف رحمۃ اللہ کی باریک نگاہی اور فرد و جماعت کے اعمال پر بابصیرت و مخلصانہ اور ہمہ گیر نگاہِ تنقید کے لحاظ سے ایک ایسی منفرد حیثیت رکھتی ہے کہ نہ صرف اُردو زبان میں بلکہ عربی زبان میں بھی اتنا عظیم مواد یکجا دستیاب نہیں ہو سکتا۔

مصنفؒ کا اس تصنیف کی بنیادی مقصد یہ ہے کہ دینِ اسلام کی پیدا کردہ عالمگیری اور بین الاقوامیت نے اس عالمِ رنگ و بو میں جو ایک عظیم اور جدید سوسائٹی پیدا کی ہے اگرچہ اس کی اصل اخلاص و دیانت پر ہے لیکن چونکہ کسی دور میں بھی یہ سوسائٹی مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے اُن ذہنوں سے خالی نہیں رہی کہ جو حدود دیانت کی رسمی شکست کے بغیر خیانت کو توحید کی ظاہری عمارت کو منہدم کئے بغیر شرک کو زہد و تصوف کے پروقار جبہ و دستار کو تار زنار کئے بغیر نفس پروری کو اور کرامتوں کے روپ میں شعبدہ گری کو ہر دور میں جنم دیتے رہے ہیں اور شیطنیت اور اس کے ناپسندیدہ مظاہر کو ہر دور میں ایسے افراد سے اپنے نشو و نما کے پورے پورے مواقع حاصل ہوتے رہے ہیں۔ اس لئے مصنف علام نے فرد و جماعت کے ہر فکری اور عملی موڑ پر اُن نامستقیم راہوں کی اپنی علمی فکری اور روحانی فراست سے اتنی مکمل نشاندہی کی ہے کہ مصنفؒ کی اس باریک بینی پر قاری انگشت بدنداں ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور "اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ" کا علمی عرفان نصیب ہوتا محسوس ہونے

لگتا ہے۔

پھر اس کے ساتھ ہی ان شیطانی مکروفریب سے بچنے کے مخصوص طریقے اور اُن پر عقل ونقل سے مبسوط ودلائل قائم کر کے حضرت مصنفؒ نے کتاب کی افادیت کو نہ صرف کئی گُنا بڑھا دیا ہے بلکہ ہر طبقہ خیال کے افراد کیلئے کتاب کو غیر معمولی طور پر مفید تر بنا دیا ہے۔

ناسپاسی ہوگی اگر مصنفؒ کے احسان کے ساتھ مترجم وناشر محترم کے احسان کو فراموش کیا جائے

ایک دینی اور اصلاحی کتاب میں زبان کے لحاظ سے جتنا سہولت پسندانہ طریق اختیار کیا جائے وہی نافع تر ہوتا ہے۔

مترجم محترم اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہیں، پھر ناشر محترم کی خوش سلیقگی نفاست کتاب وطباعت نے بذات خود۔ کتاب کو دلکش بنا دیا ہے اور ظاہر وباطن بہر لحاظ کتاب قابل دید بن گئی ہے۔

مولانا محمد سالم صاحب استاذ دار العلوم

دیوبند یوپی (انڈیا)

بتاریخ ۲۲ اگست سنہ ۶۱ء

ابن ماجہ اور علم حدیث

(تالیف) مولانا محمد عبد الرشید صاحب نعمانی

کتابت و طباعت عمدہ کاغذ نہایت اعلیٰ اور معیاری مجلد مع جیبن و خوبصورت دو رنگ گرد پوش تقطیع ۲۰×۲۶/۴ صفحات ۳۶۰ قیمت دس روپیہ (پاکستانی)

(طابع و ناشر) نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی

ہندوستان میں ملنے کا پتہ :- ادارہ تاج المعارف دیوبند یو پی

مؤلف ممدوح علم حدیث اور تاریخ تدوین حدیث پر جس بصیرت و دقت نظر کے مالک ہیں اس کے لحاظ سے اس وقت اگر موصوف کو اپنے فن میں یگانہ روزگار کہا جائے تو نہ صرف یہ مبالغہ نہ ہوگا بلکہ حق یہ ہے کہ حق ادا نہ ہو پائیگا ماضی قریب میں موصوف کی عربی میں ایک جامع تالیف بنام "ما تمس الیہ الحاجہ لمن یطالع سنن ابن ماجہ" مطبع مذکور سے منظر عام پر آکر اہل علم و بصیرت سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔

پیش نظر کتاب گو اپنے موضوع اصلی کے لحاظ سے ابن ماجہ کی سوانح و سیرت ہے لیکن چونکہ ارباب کمال کی ذاتی سوانح و سیرت خود ان کا کمالِ فن ہی ہوتا ہے اس لئے سیرت نگار کتنی بھی محتاط نگاری برتے لیکن اُن کے فن اور کمالِ فن کو خود بخود مقصدی حیثیت حاصل ہو ہی جاتی ہے "ابن ماجہ اور علم حدیث" میں بھی مؤلف ممدوح نے اگرچہ احتیاط و اختصار کو غیر معمولی حد تک ملحوظ رکھا ہے

علم حدیث پر قرونِ اولیٰ میں توجہ کی اصل بنیاد یہ حقیقت رہی ہے کہ کتاب اللہ کی حقیقی اور مستند تفسیر صاحبِ شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال و افعال سے بڑھکر کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی با لفاظ دیگر مراداتِ ربانی کے صحیح تعین کا دعویٰ ذاتِ پیغمبر کے سوا کوئی دوسرا کر بھی نہیں سکتا بلکہ قول و عمل کے ذریعہ مراداتِ خداوندی کے تعین ہی کو اگر موضوعِ نبوت قرار دیا جائے تو اس کو بیجا تاویل سے تعبیر نہیں کیا جائیگا۔ لیکن بفیضِ نبوت اس کو اس خیرِ امت کا احساس و ادراکِ سلیم قرار دیا جائیگا۔ کہ اس نے الفاظِ حدیث کو انکی صحیح مدلولات کے ساتھ محفوظ رکھنے کیلئے حیرتناک مستعدی کا ثبوت دیتے ہوئے بے مثال اندازِ حفاظت اختیار کیا۔ جو بذاتِ خود اس آخری دین کے بقاء و دوام پر ربانی حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ مدلولِ قرآنی اور مراداتِ ربانی کے اسی دوامِ احتفاظ میں جن اکابرِ امت کا نام گرامی سرنامۂ فہرست آتا ہے انہی چند گرامی ہستیوں میں حضرت محمد ابو عبد اللہ ابن ماجہ القزوینی کا اسم گرامی بھی شمار کیا جاتا ہے۔ "ابن ماجہ اور علم حدیث" میں ملتِ اسلامیہ کی اسی باامتیاز شخصیت کا تعارف خوش عقیدگی کے تحت نہیں بلکہ علم و فن کی قرار واقعی میزانِ عدل پر تول کر کرایا گیا ہے جس سے قاری کا ذہن بیکدم پس منظر کی طور پر اہلِ اقتدار حکومت اور اربابِ علم و فضل کے ایک طویل دور سے بھی واقف بنتا ہے۔ اس ہمہ گیری تحریر نے کتاب کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا دشوار کر دیا ہے کہ کتاب کی افادیت پر دلچسپی غالب ہے یا دلچسپی پر افادیت کا غلبہ ہے۔ لیکن مؤلف موصوف اور محترم ناشر صاحب اس کتاب کی تدوین و اشاعت پر مستحق صد مبارکباد ہیں۔ (م ۔ س)

ملنے کا پتہ :- اِدارہ تاج المعارف دیوبند